آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 41

pkPdf.Blogspot.Com

Visit:- PkPdf.Blo

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 41

مندر کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر تو وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، تنے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

پکچر سنسنی اور ایکشن سے بھرپور تاریخ ساز دلچسپ سلسلہ

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بزرگوں کے نظم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا نمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل جوزہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ سے چل رہا تھا۔ کمیل داد اشہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لیٹی شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وہ اپنے جماں کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جا وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا رکن چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ اسپیکٹرم کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں۔ دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جا اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیوٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا۔ سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ناگیٹر گینگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سب عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان پیچیدگیاں آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ ڈیوڈ سانچے دالاڈ کو وہ شیئرز کے سلسلے میں ایک لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تسمی کا کرنل ہی جی بھوانی، شہزی کا خاص مارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تسمی کو زبردست آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ ہیں۔ شہزی، کمیل داد اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل داد اکا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجا امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور پورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ ہی آئی اے ہ گینگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر گینگ کے مذکورہ دو نور اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کو ہار، کو ٹائیگر گینگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جعفری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹر ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جوڈرو سے برآمد ہونے والے ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کو ہارا کی یوٹ میں بلیو تسمی کے چ شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تسمی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تسمی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظر سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستہ شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کو ہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل سے اپنی بہن، ہنوبتی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کے مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کو چند ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موبن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسا کرنے مجبور میں اکٹھے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تسمی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تسمی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچاتا ہے او بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھار رکھا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہز ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل داد اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہ

اطلاع میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو تاوان ادا کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "اغوا" کرلیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور، شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ وکلی منجارہ کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمپائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے واں سے حملہ کردیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی الگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو ا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کورنیلا اور سے جی کو ہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اڑدھے کورنیلا اور سے جی ہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کو ہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں الا کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے سان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ال ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کملا اور اس کی بیٹی سونگ کملا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور واؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کملا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں ل سکی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی ہب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کملا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کملا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ یمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کئی مجاہدین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے ارمی کے بھیس میں کمیل داد اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کمیل داد اکی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ہی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو تسمی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ہاں بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش دار شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ دار کو بھاگنے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ دار کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو ضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کئی مخبارین سے مل رکھا تھا۔ ان میں راجا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی اطلاع کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی رزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز ملتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز ان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وفیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل داد اکو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے اتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود ار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو ل کر کے ایک تہہ خانے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا مان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی ایٹنی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے ں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کی حویلی کی تلاشی لیتے ہیں مگر وہاں نہ شاہ نواز ملتا ہے نہ طلسم ہیرا۔ واپسی میں شہزی رینجرز کی تحویل سے فرار ہوجاتا ہے اور چھپتا چھپاتا شاہ نواز کی حویلی پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بلاشبہ اندر کا منظر میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔ وہ کوئی سیاہ گھیر والی شلوار قمیص میں ملفوف تھا اور ہاتھ میں سیاہ پستول تھا۔ اس کی نال کا رخ صالح جان کی طرف تھا جو صوفے پر لڑھکا ہوا تھا اور اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی جبکہ اس کا سیل فون نیچے قالین پر گرا نظر آرہا تھا۔ میری نظر پستول بدست پر جمی ہوئی تھی۔

''کون ہوسکتا تھا یہ؟'' میرے سنسناتے ہوئے ذہن میں ایک ہی سوال نے گردش کی۔

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

''پریل کے گروہ کا کوئی ساتھی؟''

یہ جواب میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہ مجھے بعیداز قیاس لگا۔ اول تو اس کے گروہ کے کسی ساتھی کا میرے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ پریل بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یوں میرا اب اس ڈاکو گروہ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ رہا تھا، سونہڑیں اپنے باپ کے پاس پہنچا دی گئی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور غالباً گھر والوں سمیت کہیں غائب تھا۔

''تو پھر کون تھا یہ.....؟''

ایک ہی خیال سجھائی دیا کہ ضرور یہ صالح جان کا ہی کوئی دشمن ہوگا، مگر اگلے ہی لمحے میرا یہ خیال بھی ازخود ہی باطل قرار پایا جب میں نے اس کی آواز سنی۔

''خبردار..... اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو..... اِدھر ہی ہلاک کر دیے جاؤ گے۔''

یہ شیرنی کی طرح غراتی ہوئی آواز شکیلہ کی تھی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی جواز میرے ذہن میں تیزی سے آئے اور نکل گئے۔

''مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔'' وہ پھر غرائی۔ ''قیدیوں کو کہاں رکھا گیا ہے؟'' شکیلہ ہلکی آواز مگر غصیلے لہجے میں مخاطب تھی مگر مجھ تک بھی اس کی آواز آ رہی تھی۔ وجہ رہی ہوگی کہ میں اس پر دھیان دیے ہوئے تھا اور دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

''قیدیوں'' سے اس کی مراد یقیناً مجھ سمیت ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے ہی ہو سکتے تھے۔

''مجھے نہیں پتا..... میں تو خود مہمان ہوں یہاں.....''

بالآخر صالح جان نے جواب دیا۔ لہجے اور آواز سے ذرا بھی خوف کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

شکیلہ کو ہی نہیں بلکہ مجھے صالح جان کی اس چالاکی پر سخت طیش آیا تھا۔ میں تو خود صالح جان کو اسی مقصد کے لیے چھاپے آیا تھا مگر شکیلہ خود یہاں آ پہنچی تھی اور جانے اب تک وہ کہاں گھات لگائے چپکی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا اپنا لباس نہیں تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا وہ مردانہ شلوار قمیص میں ملفوف تھی جو اس نے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ہی پہنا تھا اور یقیناً کسی سے چھینا ہوا ہی لگتا تھا۔

اب میرا یہاں زیادہ دیر دبکے رہنا مناسب نہ تھا جبکہ شکیلہ بھی ایک طرح سے آزاد ہی تھی اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی بھی ضرورت تھی، لہٰذا میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ شکیلہ آہٹ پا کر..... بری طرح چونک کے میری طرف پلٹی اور یہی مجھ سے بھی غلطی ہو گئی کہ صالح جان نے موقع پا کر بڑی غیر معمولی اور برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، صوفے پر پڑے پڑے شکیلہ کے پستول والے ہاتھ پر اپنی ٹانگ چلا دی۔ پستول شکیلہ کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا پڑا۔

میری اچانک آمد پر صالح جان یہی سمجھا تھا کہ اس کا آدمی یا ملازم بے خیالی میں اندر گھس آیا ہے اسی لیے اس نے میری طرف گردن اور نظر اُٹھا کر دیکھا تھا مگر تب شکیلہ اور بعد میں صالح جان مجھے پہچان چکے تھے۔ جان کے لیے تو یہ صورتِ حال یک نہ شد دو شد والی بات تھی جبکہ شکیلہ تو مجھے دیکھ کر مسرت بھرے انداز میں چونک گئی تھی۔

صالح جان نے دوبارہ پھرتی دکھائی اور صوفے سے چھلانگ لگا کر ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا۔

''شکیلہ! پکڑو اِسے..... جانے نہ پائے.....'' چیخا۔ صالح جان کے کامیاب وار کے بعد وہ بھی اس جانب پلٹی تھی، لیکن تب تک صالح جان اندرونی گوشے میں کھلنے والے اس دروازے کے قریب جا پہنچا تھا جبکہ اس جانب چھلانگتے ہوئے میں اور شکیلہ دونوں ہی دوسرے سے ٹکرا کر قالین پر گرے تھے۔ مگر اُٹھنے میں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔

صالح جان اس لمحے کو موقع غنیمت جان کر اسے چلاتا دوڑا تھا، تاکہ حویلی کے ملازمین وغیرہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ میں اور شکیلہ اسی دروازے سے دوسرے گوشے کی طرف نکلے تو صالح جان کو ایک موٹی سی ادھیڑ عورت سے ٹکرا کر گرتے پایا۔ وہ عورت کوئی ملازمہ لگتی تھی۔ اس نے بوکھلا کر چیخ ماری اور ایک طرف کو لڑھک گئی۔ صالح جان اسے گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اسی وقت میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس پر گرتے ہی میں اسے رگیدتا ہوا فرش پر لے آیا۔ وہ میرے قابو میں آ چکا تھا مگر بدقسمتی کہ اس کم بخت کے شور شرابے سے حویلی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ حویلی میں صرف ملازمین کی فوج ہی نہیں بلکہ مسلح افراد بھی تھے جو زیادہ تر باہر پہرے پر تھے مگر اندر آنے میں بھلا کتنی دیر لگنی تھی۔ مجھے ایک بات کا پتا تھا، شکیلہ کا گرا ہوا پستول نہیں اُٹھا سکا تھا اور نہ ہی شکیلہ اس طرف کوئی توجہ دی تھی۔ اب اگر شاہنواز خان کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو صورتِ حال سنگین ہو سکتی تھی کوئی بعید نہ تھا کہ تھانے فون بھی کھڑکا دیا جاتا اور میں

اس بدطینت تھانہ انچارج رجب دین کو کہاں بھولا تھا۔ وہ ہنوز زمیندار شاہنواز خان کی پشت پناہی کرنے میں مصروف تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں مغلوب صالح جان پر جھپٹا تھا، کمرے میں دو مسلح افراد گنز سیدھی کیے داخل ہوئے تھے۔ یہ دونوں خاصے قدآور اور تنومند تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں اور وحشت بھری آنکھوں کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ حویلی میں اپنے دشمنوں کو اس طرح گھستے پا کر یہ دونوں حیرت و جوش میں پاگل ہو رہے تھے۔

''شکیلہ..... اِس طرف ہو جاؤ.....'' میں نے چلا کر کہا۔ شکیلہ اشارہ بھانپ گئی اور میرے عقب میں ہو گئی۔ اب میں اور صالح جان ان دونوں مسلح آدمیوں کی اُٹھی ہوئی گنز کی زد میں تھے۔

''خبردار! اپنی بندوقیں پھینک دو..... ورنہ ایک ہی جھٹکے سے اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔'' میں نے غضب ناک لہجے میں ان کی طرف گھور کر کہا۔ صالح جان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہونے لگی تھیں۔ اس نے میری آہنی گرفت سے نکلنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ وہ دونوں اسلحہ پوش بھی میری گرفت کی خطرناکی سے واقف تھے، جس میں محض ایک جھٹکے کے اندر اندر ایک ذرا جھٹکا دیتے ہی مدِمقابل کی گردن کا منکا ٹوٹ جاتا ہے۔

''چھوڑ دو اِس کو..... تم بچ کر نہیں جا سکتے۔'' ان میں سے ایک خونخوار غراہٹ سے بولا۔

''میرے سر پہ خون سوار ہے اِس وقت.....'' میں پھر شیانہ لہجے میں غرایا۔ ''آخری بار کہہ رہا ہوں..... اس کے بعد یہ گیا۔'' کہتے ہوئے میں نے صالح جان کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ کراہا..... دونوں اسلحہ بدست قہرناک انداز میں اپنے دانت پیس کر رہ گئے، اس میں بے بسی کا عنصر غالب تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور وہ محض ان کی آنکھوں کو حرکت دے رہا تھا۔

''ہمیں بس یہاں سے نکلنے دیا جائے، ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، باہر نکلتے ہی ہم اِسے چھوڑ دیں گے۔'' میں نے انہیں متذبذب پا کر دوبارہ کہا اور پھر صالح جان کی گردن سے گرفت ذرا ڈھیلی کی تو اس نے بھی پھنسی پھنسی آواز میں انہیں میری بات مان لینے کا حکم دیا۔

وہ دونوں اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر ایک طرف ہٹ گئے۔ میں نے شکیلہ کو اشارہ کیا اور ہولے سے کچھ کہا۔

اس نے تیزی سے پہلے صالح جان کا گرا ہوا پستول اور قالین پر لڑھکا پڑا سیل فون اُٹھا لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے سے نکل گئے۔ میری ہدایت پر شکیلہ نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ راہداری میں چند اور لوگ بھی جمع تھے۔ میں انہیں چلا چلا کر راستہ چھوڑنے کا کہتا رہا اور پھر ہم حویلی سے باہر آ گئے۔ ایک جگہ کار کھڑی تھی جو مجھے اسی کی لگی تھی۔

میں نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر صالح جان کی تلاشی لی تو کار کی چابی اس کے پاس سے برآمد ہو گئی۔

میں نے بدستور صالح جان کو ڈھال بنا رکھا تھا اور میری عقابی نظریں تیزی کے ساتھ گردوپیش میں متحرک تھیں۔ پستول شکیلہ نے تھام رکھا تھا۔ اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ جمایا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ میں صالح جان کو لیے عقبی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شکیلہ نے ایک طوفانی جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

پستول شکیلہ سے میں نے لے لیا تھا۔

''کسی دور ویرانے میں لے چلو اور جب تک میں نہ کہوں، کار مت روکنا۔ بیک ویو پر نظریں ڈالتی رہنا کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آ رہا ہو۔'' میں نے شکیلہ سے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا اور اس کے بعد صالح جان کو آزاد چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنی گردن سہلاتا رہا اور پھر غصے سے بولا۔ ''تمہارا کام ہو گیا ہے..... اب چھوڑ دو مجھے..... ورنہ پچھتاؤ گے بہت.....'' میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا۔ اس کے ہونٹ کا کونا پھٹ گیا اور وہاں سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔ وہ کراہ کے رہ گیا۔

''اپنی زبان بند رکھو اور صرف میرے سوال کا جواب دو..... شاہنواز چوہے کی طرح کہاں چھپا ہوا ہے؟''

''بتایا تو تھا کہ وہ جامشورو گیا ہوا ہے۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بیک وقت، خوف اور پریشانی کی جھلک بھی مترشح ہونے لگی تھی۔

''تمہارا یہ جھوٹ میں رینجرز والوں کے سامنے پہلے بھی سن چکا ہوں..... لیکن اب میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے قہر آلودہ لہجے میں کہا۔

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

''تم نے شاہنواز سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے۔'' صالح جان پر ابھی تک شاہنواز کی طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ میں دانت پیس کر بولا۔

''ٹکر ہم نے نہیں، اس نے ہم سے لی ہے اور یاد رکھنا معمولی لوگ ہم بھی نہیں ہیں۔ تمہارا یہ شاہنواز کوئی بڑی شے ہوتا تو اس طرح چوہے کی طرح چھپنے کے بجائے ہمارے سامنے آتا۔ اب میں صرف سچ سنوں گا، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ..... ہم شاہنواز سے خود ہی نمٹ لیں گے۔'' میں نے آخر میں سفاکی سے کہا اور شکیلہ کو ایک ویران جگہ پر کار روکنے کا کہا۔

ہمارے اطراف میں بنجر ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم آبادیوں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کسی نے ہمارے تعاقب میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر وہاں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ شاہنواز کی لمبی چوڑی جیپ بھی میں نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔

شکیلہ نے کار ایک ٹیکری کے قریب لے جا کر روک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور صالح جان کو گردن سے دبوچ کر باہر نکالا اور زمین بوس کر دیا۔

دن چڑھنے لگا تھا اور گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ فضا میں حبس بھی تھا۔

''بس، صالح جان! اب جھوٹ نہیں چلے گا..... ہمیں صرف اپنی ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچوں کی تلاش ہے..... شاہنواز سے بھی ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوگا..... بولو کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ..... یا پھر اس ویرانے میں تمہاری لاش چھوڑ کر ہم کوئی اور راستہ دیکھیں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''جامشورو چلے چلو، وہاں تمہاری ملاقات میں.....'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا، دوسرے ہی لمحے میرا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ بھربھری مٹی والی زمین پر بری طرح لڑکھڑا کر گرا، میں آگے بڑھا اور اس کی گردن پر اپنا بھاری بوٹ رکھ دیا۔

''بس صالح جان! تم نے جتنا بولنا تھا، بول لیا..... اب چھٹی کرو.....''

''شکیلہ! کار کی ڈکی سے کوئی بھاری آہنی شے نکالو..... میں اس کے سر کا کچومر بنانا چاہتا ہوں، گولی میں نہیں مارنا چاہتا، اس طرح اسے موت کی اذیت کا احساس نہیں ہوگا، جلدی کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس.....''

شکیلہ نے ایسا ہی کیا اور پھر ایک بھاری پانا نکال لائی۔ وہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں میں نے پستول پینٹ کی بیلٹ میں شرٹ کے نیچے اُڑس لیا اور پوری قوت سے بھاری پانے کی ضرب صالح جان کے سر پر رسید کرنا چاہی..... اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ وہ تیزی سے تڑپ کر ہٹا تھا۔ بھاری پانے کی زوردار ضرب زمین پر پڑی تھی۔ میں نے یہ دانستہ حرکت کی تھی کہ وہ خود کو ضرب سے بچا لے..... اور یہی ہوا تھا، میں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پانے کی ضرب اس کے سر پر رسید کرنا چاہی تو اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔

''ٹھہرو..... ٹھہرو..... میں..... میں سب..... بتاتا ہوں.....'' وہ گھگیا کر بولا۔

''میں صرف سچ سنوں گا اور یاد رکھنا..... اس کی تصدیق بھی تم سے ہی کرواؤں گا۔''

''وہ..... وہ اسی گوٹھ میں ہے۔''

''اس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ یہ بتاؤ کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ..... اور کیا ہماری ساتھی لڑکی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی اسی کے قبضے میں ہیں؟''

''ہاں!''

''وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''وہ..... وہ..... میری ہی رہائش گاہ پر ٹھہرا ہے.....'' اس نے بتایا اور میں چونک سا گیا۔ یہ خیال میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا۔

''وہاں اور کون کون ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''شاہنواز اور اس کے گھر والوں کے سوا اور کوئی نہیں، میرے بچے جامشورو گئے ہوئے ہیں۔''

''ہماری ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی وہاں اس کے قبضے میں ہیں؟''

''ہاں!''

''وہاں شاہنواز کے ساتھ موجود مسلح حواریوں کی تعداد بتاؤ۔''

''کوڑا خان اور بخشل کے علاوہ دو اور آدمی ہوں گے ہیں۔''

''ہم.....'' میں نے ایک خیال انگیز ہنکاری بھری اور ایک بار پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ ''یاد رکھو تمہاری اس بات کی تصدیق میں خود کروں گا۔ اگر مجھے اس میں ذرا بھی جھوٹ اور غلط بیانی محسوس ہوئی تو سب سے پہلے تم میرے عتاب کا نشانہ بنو گے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں.....'' وہ بولا۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو! یہ جنگ خود شاہنواز نے ہم پر مسلط کی ہے اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ کسی قسم کا خون خرابا ہو، اگرچہ شاہنواز نے اپنی طرف سے ہمارے خلاف کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی اب تک..... ہم چاہتے تو اب بھی اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں، وہ ہوگا اپنے علاقے کا تیس مار خان..... اگر وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور بدستور یہ جنگ ہم پر مسلط رکھی تو پھر ہم بھی دشمنوں کی گردنیں اُڑانا اچھی طرح جانتے ہیں، کیونکہ اب تک ہماری جوابی جنگ صرف اپنے دفاع کی حد تک ہے۔ ہم اسے بڑھانا نہیں چاہتے۔''

میں نے ایک لمحے کی دیر نہ کی اور اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار بدستور شکیلہ ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ صالح جان کے مطابق اس کی رہائش گاہ ایک دوسرے قریبی گوٹھ میں تھی جو یہاں سے پندرہ سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں نے شکیلہ سے ہیرے کے متعلق پوچھا۔ صالح جان کے بھی کان یقیناً اس سوال پر کھڑے ہوئے تھے۔

شکیلہ نے مختصر الفاظ میں اپنی اس رات والی کتھا سنا ڈالی۔ جس میں میرے لیے سب سے زیادہ پُرطمانیت بات یہ تھی کہ وہ ہیرا شاہنواز کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اگرچہ شکیلہ نہیں اس مقام تک لے کر ضرور گئی تھی، مگر وہاں پہنچتے ہی شکیلہ نے انہیں ہاتھ دکھا دیا تھا، وہ اسے عام سے لڑکی سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے تھے اور شکیلہ نے اسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پہلے کوڑا خان کی گن پر قبضہ جمایا، اس کے بعد وہ اسے اور اس کے ایک اور ساتھی کو زخمی کر کے فرار ہو گئی تھی۔ وہ شاہنواز کو بھی نشانہ بنانا چاہتی تھی مگر وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہیں گھات لگا کر غائب ہو گیا۔

بہرطور شکیلہ نے انہیں خوب اچھی طرح سے جُل دیا تھا۔ یہی نہیں اس نے ایک اور عقل مندی کا کام بھی کیا تھا۔ ان نے طلسم نور ہیرا وہاں سے نکال لیا تھا اور اب وہ اس کے پاس ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی شکیلہ کو مختصراً الفاظ میں کنول دادا اور اول خیر کے بارے میں بتا دیا۔ صالح جان ہماری باتیں شاید غور سے سن رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی ہوگی کہ ہم بھی سوا سیر کا وزن رکھتے تھے۔

نصف گھنٹے کے اندر اندر ہم ایک نسبتاً چھوٹے سے قریبی قصبے میں جا پہنچے۔ ہماری کار کھیتوں کے درمیان بنے کچے دھول اُڑاتے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، یہاں سے صالح جان کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔

اس چھوٹے سے دیہاتی قصبے میں داخل ہوتے ہی ہمیں دور نزدیک کسان اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے۔ سامنے کھیت پار آبادی تھی اور کچے پکے مکانوں کے سلسلے اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی بے ترتیب قطاریں دور تک جاتی نظر آ رہی تھیں۔ راستہ کھیتوں سے نکل کر اسی طرف جاتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق شکیلہ کار کو اسی طرف لے جا رہی تھی۔ کھیتوں سے نکلے تو اُپلے تھپی دیواروں کے جھونپڑ نما گھروں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہو گئے، ان کے درمیان سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئے، وہاں ایک آٹے کی چکی بنی نظر آئی جس کی چمنی سے ''پُک..... پُک..... پُک.....'' کی مخصوص دیہاتی آواز کی 'لے' کے ساتھ دھواں اُٹھ رہا تھا۔

میں کھڑکی سے باہر کوئی مناسب جگہ تاڑنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک صالح جان نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے سر کی ٹکر بڑے زور سے میری ناک پر رسید کی تھی۔ مجھے اس موٹے آدمی سے ایسی پھرتی اور ''زور'' کی اُمید نہیں تھی۔ ٹکر چونکہ اچانک اور زوردار تھی جس کے باعث میرا دماغ بری طرح جھنجھنا سا گیا اور تکلیف کے مارے میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ وہ مجھے لڑائی بھڑائی والا آدمی نظر تو نہیں آتا تھا تاہم نجانے کیا بات تھی کہ اس نے عین آخر میں کس بات سے مجبور ہو کر مجھ پر حملہ کر ڈالا تھا۔ مجھے ٹکر مارنے کے بعد اس نے کار سے اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کو ٹکر ماری، وہ لاک تھا۔ شکیلہ بوکھلا گئی اور بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صالح جان کو اس حرکت پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔ مجھے بھی ہوش دلانے کی غرض سے پکار رہی تھی۔

میں نے سنبھالا لینے کی غرض سے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھر صالح جان کی طرف متوجہ ہوا، جو اب دروازہ کھولنے کی کوشش سے مایوس ہو کر کھڑکی کا شیشہ نیچے کر رہا تھا اور میرے دبوچنے تک وہ اپنا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال چکا تھا، مجھے اگر اسے دبوچنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کسی طرح سکڑ سمٹ کر خود کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ کسی

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

طرح باہر گر جائے اور بھاگنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگ بس، یہاں تک ہی حرکت کر سکتے ہیں کیونکہ باقی ''حرکت'' ان کے حواریوں کو آتی ہے، صالح اور زمیندار شاہنواز جیسوں کو نہیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بھینس جیسی ''پشک'' کو دبوچا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ تڑپا تو میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ وہیں سیٹ پر لمبا پڑ گیا۔

''روانہ ہوتے وقت ہمیں اسے رسی سے باندھ لینا چاہیے تھا۔'' شکیلہ نے کہا۔

''گزرے ہوئے پر پچھتانا کیسا..... تم ڈرائیونگ پر اپنا دھیان رکھو۔'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اگلی سیٹ پر شکیلہ کے برابر آ بیٹھا۔

''اس طرف موڑ لو گاڑی۔'' میں نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہ سارا اب میدانی راستہ تھا اور اس طرف نسبتاً کچھ پختہ اور بڑے مکان نظر آ رہے تھے۔

''مگر..... ہمیں صالح جان کے گھر کا راستہ نہیں معلوم.....'' شکیلہ نے میری توجہ دلائی۔

''کوئی پروا نہیں..... تم چلتی رہو اور وہ دیکھ رہی ہو ایک کیکر کا درخت ہے شاید..... اس کی چھاؤں میں کار روک لینا۔''

شکیلہ نے ایسا ہی کیا۔

''کی چین میں الارم لاک ہے، ڈکی کا بٹن پش کرو جلدی۔'' میں نے شکیلہ سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں صالح جان کے بے ہوش وجود کو ڈکی میں بند کر چکا تھا۔

''تم اِدھر ہی ٹھہرو..... میں ابھی آتا ہوں.....'' شکیلہ سے کہہ کر میں آگے بڑھا، جہاں کچھ ہاری (مزارعے) اجڑکوں کے پگڑ بانھے ایک چھتنار پیڑ کے نیچے بیٹھے لسی وغیرہ پی رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے انہیں سلام کیا اور صالح جان کے بارے میں پوچھا۔

''سائیں.....! شہری بابو لگتے ہو.....'' ایک مدقوق سے ہاری نے کہا پھر سامنے بنے پختہ مکانوں کی ترتیب وار قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھ رہے بابو سائیں.....! پہلی قطار کا تیسرا مکان..... نیلے رنگ والا جس کا کالا لوہے کا گیٹ ہے، یہی صالح جان کا ہے۔'' یہ بتانے کے بعد وہ اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔

''وڈی مہربانی بابا!'' میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس کار کی طرف پلٹا۔ مجھے اندازہ تھا کہ صالح جان جیسے آدمی کو اس چھوٹے سے قصبے میں سبھی جانتے ہوں گے۔

مکان پہنچ کر میں نے شکیلہ کو سرکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک دم برابر والی سیٹ پر جا گھسکی۔ اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ لی۔

میں نے مطلوبہ مکان کا رخ کرنے کے بجائے دوسری طرف کار لے گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ان تمام نظم آنے والے پختہ مکانوں کا عقبی حصہ تھا۔ تھوڑا اور دور لے جا کر ایک پرانی سی عمارت نظر آئی۔ کار اس کے پیچھے لے جا کر روک دی۔

''میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' شکیلہ نے فوراً کہا۔

''نہیں، تم اِدھر ہی رہو گی۔ صالح جان کو اگر ہوش آ گیا تو وہ اندر سے ڈکی بجانا شروع کر دے گا۔ کوئی قریب سے گزرنے والا سارا کام خراب کر دے گا۔''

''تو کیا مجھے اسے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑے گا؟''

''ظاہر ہے..... تم جیسے ہی محسوس کرو کہ وہ ہوش میں آ گیا ہے تو ڈکی کھول کر ایک پنچ اس کی کنپٹی پر جڑ دینا۔ خیال رہے ہتھ ہولا ہو..... مرنے نہ پائے۔ یہ شاہنواز خان کا کوئی قریبی رشتے دار ہے۔ نیا سیاپا پڑ جائے گا۔''

میں پلٹا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا مطلوبہ مکان کی عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔

گرمی شدید پڑنے لگی تھی۔ دھوپ الگ تپائے دے رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

یہاں سارے مکان ایسے تھے کہ ان کے صحن کھلے اور گیٹ بڑے تھے، عقب میں کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ایک دو روشن دان بھی تھے، مگر وہ ''آدم گزار'' نہ تھے۔

مکان ایک ساتھ جڑے ہوئے نہ تھے جیسا کہ عموماً شہروں میں ہوتے ہیں۔ دیہاتی علاقہ تھا اور زمین بہت تھی۔ ہر مکان کے درمیان ایک گلیارا بنا ہوا تھا، میں ایک ایسے ہی گلیارے میں جا گھسا اور..... وہاں سے مجھے کچھ سیوریج کی لائنیں اُوپر تک جاتی دکھائی دیں۔

یہ مکان ایک منزلہ تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہ تھا اور پھر ایک پائپ کو پکڑ کر جنگلی بلے کی طرح اُوپر چڑھ گیا۔ صحن کی دیوار کی منڈیر پر پہنچ کر تھوڑا اندر جھانکا۔

صحن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر رلی پڑی تھی۔ یہ وہی رلی تھی جو میں نے پریل کے جنگل ڈیرے والے جھونپڑ میں بھی دیکھی تھی۔ اس کے متعلق اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سندھ کا مشہور ''بچھونا'' تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں کی دیواروں میں اے سی نظر آ رہے تھے۔ ایک سنگی زینہ اُوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔

میدان صاف پا کر میں اندر کود گیا اور کچھ سوچ کر زینے طے کرتا ہوا اُوپر آ گیا۔ یہاں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جو بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی جھری سے دوسری طرف جھانکا۔ کشادہ سی جگہ پر دو کھری چارپائیاں نظر آئیں۔ یہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ کیا مکان میں کوئی نہ تھا؟ ایک خیال آیا کہ مجھے مین گیٹ کا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ کہیں اُس پر تالا وغیرہ تو نہیں لگا ہوا تھا؟ اب تو میں اندر آ گیا تھا پلٹنے کا وقت نہ تھا۔

یہاں مجھے دو کمرے نظر آئے، ان کی دیوار پر ایک ہی اے اسی لگا ہوا تھا۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ دیہاتی طرز کے کشادہ مکان تھے جن کی طرزِ تعمیر سادہ سی نظر آتی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ آہستگی سے دھکیلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا پہلے ایک کمرے کے دروازے کے قریب آ کر رکا، اس کے چوپٹ پٹ سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینا چاہی مگر خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف سرکا۔ اس کے اندر مجھے کسی کے سسکنے اور دبی دبی سی آوازیں آتی سنائی دیں، دوسری بات یہ تھی کہ اس کے دروازے پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا۔ یہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کامیابی میرے قریب تھی۔ میں نے اس کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی، اندر نیم تاریکی تھی۔ گویا اس کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند کیے ہوئے تھے۔

اسی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک طرف کونے میں خزاں نصیب ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے بیٹھے سسکتے ہوئے نظر آ گئے، جی میں تو آئی کہ اسی وقت انہیں پکار کر تسلی دے ڈالوں مگر ابھی یہ قبل از وقت ہوتا۔ کیونکہ میں کچھ اور ہی حکمتِ عملی تیار کیے بیٹھا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ لڑی سے نیچے آیا اور ابھی میں نے آخری زینہ ہی طے کیا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے باہر نکلا اور کلی کر کے پچکاری صحن میں ماری۔ میں ایک دم زینے کے نچلے خلا میں جا دبکا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، نظریں اسی شخص پر جمی ہوئی تھیں اور میں اسے پہچان گیا تھا، جوشِ اُبال سے میرا دماغ گھوم گیا۔ وہ مردود شاہنواز ہی تھا۔

''اڑے او..... بخشل!'' معاً اس نے کھرکھراتی مگر تحکمانہ انداز میں آواز دی، تو ساتھ والے کمرے سے بخشل باہر نکل آیا۔

''حاضر سائیں وڈا.....!''

''اڑے! یہ صالح جان فون نہیں اُٹھا رہا ہمارا..... جا...اس کی کھیر کھیریت تو معلوم کر حویلی جا کر.....'' شاہنواز نے اس سے تحکمانہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا، صالح جان اس کی کال ریسیو کیوں نہیں کر پا رہا تھا، کرتا بھی کیسے۔ ایک تو وہ کار کی ڈکی میں بے بس پڑا تھا، دوسرے میں نے اس کا سیل فون کسی مقصد کے تحت آف کر رکھا تھا۔

''سائیں بھوتار.....! ہو سکتا ہے، موبائل چارج نہ ہو، ویسے صبح تڑکے میں نے یار و کو حویلی روانہ کیا تھا اور اپنے موبائل سے صالح صاحب سے بات کر کے کھیر کھیریت معلوم کر لی تھی۔ رنجیرز والے آئے تھے، ان کے ساتھ وہ..... اُونچا لمبا چھوکرا بھی تھا، پر سائیں وہ بری طرح ناکام ہو کے واپس لوٹ گئے تھے اور کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی، لیکن صالح صاحب کا یہی مشورہ تھا کہ ابھی آج کا دن اور ادھر ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔'' بخشل نے گویا ایک ہی سانس میں ساری صراحت بتا دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے زمیندار شاہنواز ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کیونکہ بخشل نے دوبارہ کہا۔

''سائیں بھوتار کے لیے ناشتے یا چاں پاڑیں کا بندوبست کیا جائے؟ یا ابھی شغل پاڑیں (شراب نوشی) فرمائیں گے؟''

''اڑے نہیں بابا! خالی پیٹ شغل پاڑیں کا بھلا کیا مزہ آئے گا، ایسا کر اُس چھوکری سے کہو فوراً ہمارے لیے دیسی انڈوں کا آملیٹ اور ایک انڈا قیمہ (خاگینہ) تیار کرے.....'' شاہنواز بولا۔ ''اور..... ہاں..... سن!''

''جی سائیں حاضر.....!'' بخشل نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''بچے گھی کے پراٹھے بھی بنوا لینا۔ لسی اور دہی کا بھی بندوبست کرے۔''

''برابر سائیں بھوتار..... برابر!''

''یہ پڑاں کوڑا خان کدھر ہے؟''

''سائیں وڈا! وہ اندر سو رہا ہے۔ رات دیر تک جاگے تھے ہم دونوں۔'' بخشل نے جواب دیا۔

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

شاہنواز واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ... اپنی بیٹی سونہڑیں کو اس نے کہاں رکھا تھا؟ پتا نہیں یہاں تھی یا کہیں اور جگہ منتقل کر دی گئی تھی۔ تاہم اب اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا تھا مگر دکھی دل سے یہ ضرور سوچتا تھا کہ جب اس بے چاری کو یہ پتا چلے گا کہ اب اس کا محبوب پریل چانڈیو اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو اس پر کیا بیتے گی؟

مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ شاہنواز اور اس کے دونوں مقرب خاص یعنی کوڑا خان اور بخشل یہاں سے آج رات تک ہلنے والے نہیں، میں خاموشی سے مگر اسی احتیاط کے ساتھ واپس پلٹ گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا..... کار کے پاس آ گیا۔

''لگتا ہے کامیاب لوٹے ہو.....'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی شکیلہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں!'' میں نے اس کی برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر براجمان ہوتے ہی فوراً صالح جان کا سیل ہاتھ میں لیا اور اسے آن کرنے کے بعد ڈی جی رینجرز میجر وسیم بھٹی سے رابطہ کیا۔ ان کا سیل نمبر تو مجھے معلوم نہ تھا البتہ ضلعی ہیڈ کوارٹر کا لینڈ لائن نمبر مجھے پتا تھا۔ کسی اور نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو رینجرز کارپس (corps) ہیڈ کوارٹر.....'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''جناب! مجھے میجر وسیم بھٹی صاحب سے بات کرنی ہے، فوراً۔'' میں نے کہا۔

''اپنا تعارف کرواؤ اور کس سلسلے میں بات کرنی ہے؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''اِٹس ٹاپ سیکریٹ سر! وقت کم ہے..... مجھ سے بات کرتے ہی وہ مجھے فوراً پہچان جائیں گے کہ میں کون ہوں اور اُن سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔''

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی، اس کے بعد اس نے مجھے ہولڈ کرنے کا کہا اور دوسری جانب سے قومی ترانے کی موسیقی سنائی دینے لگی۔ شاید بات کرنے والے نے انٹرلنک کال سسٹم کے ذریعے میجر صاحب سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے دوسری جانب سے میجر وسیم صاحب کی بارعب آواز سنائی دی۔

''ہیلو، کون.....؟''

''جناب! میجر صاحب! میں بات کر رہا ہوں ششش..... شہزاد احمد خان..... شہزی۔'' میں نے اپنا بتایا۔ فرطِ جوش سے میرا لہجہ مرتعش تھا۔

''ہمم..... کیا معرکہ انجام دیا ہے اب تم نے.....

دوسری جانب سے میجر صاحب کی ایک گمبھیر تا سی ہنکاری کے ساتھ آواز ابھری۔ میں ان کی بات اور بالخصوص لہجے پر قدرے چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ کچھ معنی خیز سا ہی لہجہ تھا ان کا۔ میں نے سب سے پہلے ان سے اپنے فرار کی معذرت چاہی اور جب اصل بات کی صراحت بتانے لگا تو اُنہوں نے میری بات کاٹ کر فوراً کہا۔

''معذرت کی ضرورت نہیں، جو کام خود کسی سے کروانا چاہتے ہیں وہ اسی طرح ہی کرواتے ہیں.....'' میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔

''تت..... تو کیا سر! آ..... آ..... آپ.....''

''سمجھ گئے کافی ہے۔'' اُنہوں نے پھر میری بات کاٹی۔ ''ایسی باتیں فون پر نہیں کہی جاسکتیں۔ کمال ہے تم خود ایک پاور ایجنٹ رہ چکے ہو، کیا طریقہ کار بھول گئے ہمارا..... لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا..... ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کے لیے ایسی کڑوی گولیاں ہمیں نگلنی پڑتی ہیں..... یہ بھی مصلحت کا ایک تقاضا ہے۔''

''گریٹ سر!'' میں نے مسرت و جوش سے کہا۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ مجھے رینجرز کے قبضے سے اس طرح فرار کے لیے کوئی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اُس رات رینجرز کی گرفت سے فرار ہونے کا یہ دانستہ موقع فراہم کیا گیا تھا کیونکہ شاید میجر وسیم کو میرے اندر کی تپش کا اندازہ ہو چکا تھا اور شاید یہ بھی کہ میں..... اس مہم منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کس قدر پُرجوش ہو رہا تھا۔

''اب کام کی باتیں کر لو تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' دوسری جانب سے دوبارہ ان کی آواز اُبھری اور میں نے پھر انہیں ''کام'' کی ساری باتیں بتا دیں۔ اُنہوں نے مجھ سے میری لوکیشن پوچھی اور پھر مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ میجر وسیم بھٹی نے مجھ سے کہا۔ اگر وہ طلسمِ نور ہیرا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں میری کچھ ایسی باتوں کا بھی یقین آ جاتا جو اُن کے لیے اب تک میری طرف سے شکوک کا سبب بنی ہوئی تھیں اور اب وہ ہیر میرے پاس (شکیلہ کے پاس) موجود تھا۔

یہ قصہ نمٹنے میں کم و بیش پون گھنٹا لگا تھا۔ رینجرز کی

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

بھاری تعداد نے صالح جان کے مکان پر ریڈ کیا اور وہاں سے اس بدطینت اور خود کو بڑی ''شے'' سمجھنے والے فرعون صفت وڈیرے شاہنواز خان کو اس کے قریبی ساتھیوں کے ذریعے گرفتار کرلیا۔ ساتھ ہی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی بازیاب کرا لیے گئے۔ صالح جان کا تھوٹ پکڑا گیا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ ان سب کو رینجرز ہیڈ کوارٹر اور وہاں سے اسپیشل انٹروگیشن سیل میں منتقل کردیا گیا۔

کمبلی دادا اور اول خیر میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے یہ ساری مہم بازی اپنے اُوپر ایک خطرناک رسک لے کر ہی ماری تھی۔ میری ذرا سی غلطی مجھے ہی نہیں میرے ساتھیوں کو بھی کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پھنسا سکتی تھی۔

البتہ طلسم نور بیرے سے متعلق تفصیلی گفت وشنید کے لیے ہم دونوں کی ایک کمرے میں ون ٹو ون سنجیدہ نوعیت کی ایک میٹنگ ہوئی۔

''مسٹر شہزاد! میں اب اس قومی امانت کے سلسلے میں تمہارا آئندہ کا پروگرام جاننا چاہوں گا۔''

''یس سر!'' میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے میں اس اہم اور قومی امانت کی ذمے داری سے بری الذمہ ہو جاؤں، یہ طلسم نور بیرا ہمارے وطن کی ایک مقدس اور قابلِ فخر امانت ہے۔ کوشش تو میری یہی تھی کہ میں اسے آپ جیسے ہی کسی ذمے دار، محبِ وطن افسر کے حوالے کردوں، لیکن اس کے علاوہ میرے کاندھوں پہ ایک اور اہم ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے، اخلاقی فرض سمجھ لیں اسے، اگر وہ بھی آپ کے توسط سے پوری ہو جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔'' میری بات پر میجر وسیم بولے۔

''ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس ذمے داری کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے اور طلسمِ نور بیرے کو بعض حکومتی افسروں کے توسط سے اسے ذمے داران کے سپرد کر دیا جائے، کیونکہ عنقریب ملک میں ایک بڑی عظیم الشان نوادراتی نمائش لگنے والی ہے، یہ ایک بین الاقوامی سطح کی نمائش ہے جس میں بیرونِ ممالک کے مندوبین، کچھ اعلیٰ افسر اور عالمی مالیاتی فنڈ کے افسران شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ نمائش ملک کی ترقی اور اقتصادیات میں نہایت اہم رول ادا کرے گی، ایسے میں طلسمِ نور بیرے کی نمائش میں موجودگی..... اس کی اہمیت اور افادیت کو دوچند کر دے گی۔ وہ اس نادر و نایاب ہیرے کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے، اس کی شہرت چار دانگ پھیلے گی، ملک کا نام روشن ہوگا۔ اس کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں خطیر رقم دیں گی اور بھی بہت سے فائدے متوقع ہوں گے۔ لیکن اس عظیم کارنامے کا سہرا تمہارے سر ہوگا..... اور یہی نہیں ہماری مصدقہ اطلاعات اور معلومات کے مطابق تم نے کا عرصہ پہلے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندر داس سکسینہ بھی گرفتار کروایا تھا۔ جس پر مقدمہ چل رہا ہے اور اسے پھانسی کی سزا دی گئی ہے، یہ ووکارنامے تمہارے معمو نوعیت کے نہیں ہیں، لہٰذا تمہیں اس نمائش میں خاص طور شامل ہونا پڑے گا، تاکہ وہاں تمہیں ایک بڑے اور تو اعزاز سے بھی نوازا جائے گا۔''

''سر! یہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر محبِ وطن پاکستانی کے لیے یقیناً فخر کی بات ہوگی مگر سر جس اعزاز آپ بات کر رہے ہیں، اس کا میں نہیں کوئی اور حق دا ہے۔'' میں خوش تو ہوا تھا مگر اصل بات بھی کی۔

''کیا مطلب؟'' میجر وسیم چونک کر بولے۔

''یس سر!'' میں نے کہا اور پھر انہیں سب سے پہلے بشام چھلگری کے بارے میں مختصراً تفصیل سے آگاہ کیا پھ اس کی بیوی ارم اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کا ذکر بھی کرتے ہوئے میجر وسیم سے بولا۔

''جناب! مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر آپ حکومت کی طرف سے اس کا کریڈٹ بشام کی بیوہ اور اس کے دونو بچوں کے نام کر دیں، انہیں تحفظ اور مالی مدد کی ضرورت ہے، دونوں بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے، ارم کے لیے باعزت اور اچھی نوکری کا بھی بندوبست کر دیا جائے۔ بس یہی میری آپ سے درخواست ہے۔''

میری بات پر میجر وسیم چند ثانیے کسی گہری سوچ میں مستغرق رہے، اس کے بعد میرا کاندھا تھپتھپا کے بولے۔

''ویل مسٹر شہزاد! تمہاری اس اخلاقی ہمدردی اور اقدام کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اس عظیم قومی امانت کے لیے بلاشبہ بشام نے ہی اپنی جان کی قربانی دی تھی لیکن بعد میں تو تم نے اس مقدس امانت کی اپنی جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کی اسے خطرناک بین الاقوامی گروہ اور جنگی جنونی جرنیلوں سے جان پر کھیل کر حاصل کیا۔ نام تو تمہارا بھی آئے گا اور پھر تم ہو بھی وطنِ عزیز کے ایک گمنام سپاہی تاج دین کے بیٹے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن..... مجھے اس کی ضرورت

نہیں، آپ کسی طرح ارم اور اس کے دونوں بچوں کے لیے محفوظ مستقبل کا بندوبست کرا دیں، یہی میرے لیے بہت ہو گا۔''

''لوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں، بدخوردار! مگر آفرین ہے تم پر کہ تم دوسروں کے لیے جیتے ہو..... انشاء اللہ میں ایسا ہی کروں گا، لیکن میں تمہیں اب رینجرز فورس کا ایک ''آنریری'' عہدہ تفویض کرانے کا وعدہ کرتا ہوں..... جو تمہیں پاک آرمی کی طرف سے اسپیشل طور پر دیا جائے گا۔''

میجر وسیم کی اس بات میں میرے لیے دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ کیونکہ میرے دشمنوں نے بیگم ولا اور زہرہ بانو کو اس کے ساتھیوں سمیت (جن میں، میں بھی شامل تھا) جھوٹے شواہد کے ذریعے ملتان رینجرز کو ان کے خلاف کر رکھا تھا، اس سلسلے میں یہ آنریری عہدہ جو یقینی طور پر پاور ایجنٹ کے مساوی ہو سکتا تھا، مجھے تفویض کرنا سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔

''میں تمہیں خفیہ رینجرز کمانڈو کا عہدہ دینے کی سفارش کروں گا۔'' میجر صاحب نے آخر میں کہا تو میں خوشی کے دبے دبے احساس تلے بولا۔

''سر! اگر ایسا ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری اب تک کی محنتوں کا صلہ مل گیا۔ لیکن ابھی اس میں ایک طویل پروسس کی ضرورت ہوگی، تاہم میں آپ سے ایک اسپیشل فیور کی درخواست کروں گا، چونکہ میں اب ملتان جانے کا قصد کیے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہاں کی رینجرز فورس جب مجھ سے کسی قسم کی بازپرس کرے تو میں اپنا کوئی کارڈ کھیل سکوں۔''

''سمجھ گیا.....'' وہ مسکرا کر بولے پھر مجھے ایک خصوصی ٹ لائن کا نمبر اور کوڈ ازبر کروایا اور بولے۔

''تم فقط یہ کوڈ اور اس نمبر پر ان کے کسی بھی بڑے فسر کو رابطے کے لیے کہہ دینا، وہ تمہیں منٹوں میں تو کیا یکنڈوں کے اندر اندر نہایت عزت واحترام کے ساتھ چھوڑ یں گے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ سر!'' میں نے خوش ہو کر ہا۔

''نائٹ مینشنڈ! یو آر ڈیز روڈ.....'' وہ بارعب لہجے بولے اور کھڑے ہو کر مجھے سیلیوٹ کیا تو میں نے بھی انداز میں ان کے سیلیوٹ کا جواب دے ڈالا۔

ایک بڑی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد خود کو بہت ہلکا پھلکا تصور کرنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم نے پنجاب جانے والی ایک لگژری کوچ پکڑی اور ملتان کے لیے روانہ ہو گئے۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے ارم اور اس کے دونوں بچوں سے بھی ملاقات کی۔ میں نے اسے سب بتا دیا تھا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ جہاں کہے گی اسے باعزت طریقے سے وہاں پہنچا دیا جائے گا اور نہ صرف یہ بلکہ حکومتی سطح پر اس کے لیے بہت کچھ کیا جانے والا تھا۔ خود میجر صاحب نے بھی اسے بیٹی کہہ کر تسلی اور اطمینان دلایا تھا۔ میں نے یہ بھی ارم سے کہا تھا کہ میں تمہارے سلسلے میں میجر وسیم بھٹی صاحب سے ٹیلی فونک رابطے میں رہوں گا اور زندگی رہی تو اپنی پیاری بہن اور دونوں بھانجوں سے ضرور بھی ملاقات کروں گا۔

☆☆☆

ہم اسی طرح براستہ لاڑکانہ دادو سے پنجاب کی جانب محوِ سفر تھے۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور بندے کی ثابت قدمی اور بلند ہمتی کو دیکھتے ہوئے اس کی پوری مدد بھی فرماتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ بندہ خود حیران ہو جاتا ہے، میں خود بھی اس وقت ان تمام حالات پر غور کر رہا تھا۔ میرا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ سیٹ خاصی آرام دہ تھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے نیند نے آن لیا۔

صبح جاگا تو ملتان کے قریب تھے اور صبح ہو چکی تھی۔

میں نے دانستہ ایسے ہی وقت کا انتخاب کیا تھا کہ دن میں ہی ''بیگم ولا'' کا رخ کروں۔ رات میں دشمنوں کا پہرا غیر معمولی ہوتا ہے جبکہ دن میں وہ بات نہیں ہوگی۔ ایک خیال اور اندازہ تھا اور نہ تو ہمیں ہر وقت ہی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہم ملتان کینٹ کے قریب اُتر گئے۔ اول خیر کا دل چائے کی چسکی لگانے کو چاہا تھا مگر میں نے منع کر دیا۔

''اپنے منہ اور پیٹ کو ذرا سنبھال کر رکھو..... جانتے نہیں ہو کہ یہاں ہمارے کتنے خطرناک، دیدہ ودانستہ دشمن پھیلے ہوئے ہیں.....'' خلیلہ نے اسے گھور کر کہا۔ ملتان میں اس وقت سخت گرمی پڑ رہی تھی، ملتان کی خشک گرمیاں ویسے بھی بہت مشہور ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان کوئی بحث پڑتی، میں نے فوراً ایک ٹیکسی والے کو روکا، ڈرائیور کو بیگم ولا کا پتا بتایا اور اس نے کرایہ..... اس کے بعد ہم چاروں اس میں سوار ہو گئے۔

ایک طویل عرصے بعد میں بیگم ولا میں قدم رکھنے والا تھا۔ میرا ذہن بہت سے احساسات اور خیالات کی آماجگاہ

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

بنا ہوا تھا۔ اماں جی اور ابا جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسے ہوں گے؟ میرے انتظار میں تو ان کی بوڑھی آنکھیں کس قدر تھک گئی ہوں گی۔ میں ان کا لختِ جگر ان کی اب تک کی رفاقت کی وہ نشانی تھا جس کی خاطر ان دونوں بوڑھوں نے اپنی پُرمصائب زندگی کو بڑا خراج عطا کیا تھا اور بالآخر میں نے اپنی چھاؤں اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کو پایا تھا۔ زہرہ بانو تھی، جسے میری ذات میں ہر وقت لئیق شاہ کا ہی پرتو نظر آتا تھا اور وہ ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود اسی ایک رشتے سے مجھے، اماں جی اور ابا جی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ بعض رشتے کس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے کے باوجود تاعمر قائم رہتے ہیں، نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ نبھائے بھی جاتے ہیں اور زہرہ بانو یہی کر رہی تھی۔ یہی اس کی وہ نرالی ادا تھی جس نے اس کے لیے میرے دل میں ازحد احترام پیدا کر رکھا تھا۔

انہی خیالات میں جب ہم بیگم ولا کی علاقائی حدود میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ بے طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ اعصابی کیفیات بھی ایک عجیب سے ارتعاش کا شکار تھیں۔

گبیل دادا اور اول خیر، کھڑکی سے بڑی گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ خود میری عقابی نظریں تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ بہ قول زہرہ بانو کے، ہمارے بہت سے دشمنوں نے اس عمارت کو اپنی کڑی اور خفیہ نگرانی میں لیے رکھا تھا۔ کون آ رہا ہے جا رہا ہے، وہ سب ان کے علم میں تھا۔ البتہ یہ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میری آمد کی خبر دشمنوں تک پہنچی تھی یا نہیں، اگر پہنچ جاتی تو ان میں تھرتھلی مچ جانا لازمی ہوتا۔

بیگم ولا کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ہماری ٹیکسی رکی۔ کرایہ وغیرہ ادا کرنے کے دوران میں ہی گیٹ کھل چکا تھا۔ اندر بنے گارڈ کیبن سے دو افراد تیزی سے باہر کو لپکے تھے، ان کے فوراً بعد تین مسلح افراد بھی اندر سے برآمد ہوئے اور ہمارے دائیں بائیں محتاط انداز میں الرٹ کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں ہمارے بجائے تیزی سے ہمارے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اول الذکر دو محافظ ہمارا سامان سنبھال رہے تھے۔

اندر لگے خفیہ کیمروں میں شاید انہوں نے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکتے اور ہمیں اُترتے دیکھ لیا تھا۔ سب سے پہلے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ہی گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا اور سامنے ہی مجھے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دے گئی، یوں کہ..... جیسے وہ اپنے آپ سے ہی بے گانہ رہ چکی ہو۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کے دوپٹے میں اس کا گورا روپ نکھرا ہوا لگتا تھا۔ وہ کچھ کمزور سی نظر آ رہی تھی، دل کش سی کشادہ آنکھوں میں جیسے کسی طویل انتظار کا عذاب تڑپتے ہوئے آبگینوں کی کرچیوں میں جھلملا رہا تھا۔ گلنار سا چہرہ کسی قدر کِھلا ہوا نظر آتا تھا مگر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک عرصے سے کملایا ہوا بھی ہے۔ اس کے لبوں کا مدھم مدھم ارتعاش بہ زبانِ خاموشی ایک داستانِ غم کی کئی اَن کہی..... کہانیاں سنا رہا تھا۔ اس نے اپنے شہد رنگ بالوں کو بھی سنوارا ہوا نہ تھا، بے ترتیب سے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی بہت سی لٹیں، مہتابی چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی حیرت میں ڈوبی اس کی آواز ابھری۔

''شش..... شہزی! کک..... کیا یہ واقعی تم ہو.....؟''

میرے ہونٹوں سے بے اختیاری ایک مسکراہٹ کسی نوید سحر کی طرح طلوع ہوئی، جس نے گویا اُداس اور تاریک جھیل پر سویرا کر دیا۔ وہ متلاطم ہوئی، کسی طوفان کی طرح اُمڈی اور میری طرف بڑھی۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور اپنا سر جیسے میرے کشادہ سینے کے تخت پر رکھ دیا۔ وہ گھٹے گھٹے انداز میں سسک رہی تھی۔ میں نے..... آہستگی سے اسے سنبھالا دیا، ہولے سے اس کا کاندھا تھپکا اور..... بہت دھیرے سے الگ کر کے مسکراتے لہجے میں کہا۔

''دیکھ لو..... زہرہ! سارے ساتھی میرے ساتھ ہیں، تمہارے سامنے ہنستے مسکراتے کھڑے ہیں، یہ سب یقیناً ماں جی اور تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ شکیلہ، زہرہ سے لپٹ گئی، اول خیر نے سر جھکا کر زہرہ بانو کو سلام کیا تو زہرہ بھیگی بھیگی سی آنکھوں اور اشک آلودہ لہجے میں بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''اس شیطان کی مجھے زیادہ فکر تھی..... اور..... وہ کون ہے.....؟ میں اسے پہچان رہی ہوں..... شاید۔''

اس کا اشارہ میرے عقب میں سر جھکائے کھڑے گبیل دادا کی طرف تھا۔

ہمیں صحیح سلامت، ہنستا مسکراتا اور خوش دیکھ کر زہرہ

بانو بھی اپنا بہت کچھ ایسا بھلائے ہوئے تھی جو اس کا متاعِ جاں بھی تھا اور..... سرمایۂ حیات بھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور بذلہ سنجی کا اظہار کر رہی تھی۔

''سلام بیگم صاحبہ.....!'' تب ہی گبیل دادا نے چند قدم آگے اُٹھاتے ہوئے زہرہ بانو کو سلام پیش کیا۔ میں نے دیکھا۔ زہرہ بانو نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گبیل دادا کے اُونچے لامبے کاندھے پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔ گبیل دادا نے سر اُٹھا کر زہرہ بانو کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ زہرہ اس کے کھردرے اور بھاری چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''مجھے اور کسی پر اتنا یقین نہیں کم از کم تم پر ضرور تھا گبیل دادا! کہ ہمیشہ کی طرح تم اپنی زندگی کو ساتھیوں کے لیے داؤ پر لگائے رکھو گے اور شہزی سمیت ان سب کو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کی ڈور سے باندھ کر ایک دن میرے سامنے لا کھڑا کرو گے، تم نے مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔''

''بیگم صاحبہ! میں نے آج اپنا وعدہ پورا کر دیا..... لیکن کاش! میں اپنے یار! لئیق شاہ کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ اسے بھی اسی ڈور سے باندھے رکھتا، پر وہ جھلا تو بہت جلدی میں تھا اور میں بھی اس کے لیے کچھ کرنے کا موقع ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ یہی ایک ایسا بوجھ ہے، جو ایسے وقت میں مجھے رُلا کر رکھ دیتا ہے کہ کاش! میں اس کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ معافی چاہوں گا سب سے کہ یہ وقت ایسے موضوع کا تو نہیں، پر کیا کروں، یہ نہ بھولنے والا سانحہ بھی ایسے ہی وقت میں یاد آ کر دل و جگر کو تڑپا دیتا ہے۔'' کہتے کہتے گبیل دادا کا لہجہ رُندھ گیا، آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ جیسے میں اول خیر کا یار تھا اسی طرح میرا بڑا بھائی لئیق شاہ مرحوم گبیل دادا کا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُسے بھلا سکتا تھا۔

لئیق شاہ کے ذکر نے فضا کو ایک دم ساکت اور مغموم سا کر دیا۔ تب ہی میں نے آہستگی کے ساتھ سب سے کہا۔

''اندر آ جاؤ.....''

نشست گاہ میں دو ملازم مرد عورت موجود تھے۔ سب وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے، میں نے ماں جی اور ابا جی کے کمرے کا رخ کیا۔ بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، ایک جذباتی کیفیت تھی، عقیدت و محبت کا ایک طوفان سا اُمڈنے کو مچل رہا تھا، اپنے بوڑھے ماں باپ کا سامنا کرنے پر، ماں جی سے تو میری باتیں ہوتی رہی تھیں، اور ان کا ساتھ بھی رہا تھا، مگر اپنے باپ کو جب میں نے بلیو ٹسلی اور اس کے سربراہ سی جی بھوانی کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اس وقت باپ کی یادداشت ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے پہچان پاتا، تاہم ڈاکٹروں نے تسلی دی تھی کہ..... اب اپنوں میں وقت گزارنے کے سبب عین ممکن ہے کہ گریجولی (رفتہ رفتہ) وہ اپنی اصل یادداشتوں میں لوٹ آئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں پھر فوراً ہی انڈیمان والے مشن پہ روانہ ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا، جہاں اے سی آن تھا۔ فضا کمرے کی خاصی آرام دہ اور سکون پرور ہو رہی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے کہ ماں جی اور ابا جی بڑے سے جہازی سائز کے بیڈ پر نیم دراز سے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ان دونوں کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ بادیٔ النظر میں وہ مجھے کوئی ملازم ہی سمجھے تھے مگر جب میں پوری طرح سے ان کے سامنے آ گیا تو ماں تو جیسے ایک ٹک مجھے دیکھتی ہی رہ گئی مگر انہیں شاید پھر بھی یقین نہیں آیا تھا، انہوں نے جلدی سے بیڈ سائڈ ٹیبل سے اپنا سیاہ کمانی والا چشمہ اُٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا، تب ہی وہ جیسے ایک دم سکتے میں آ گئیں، میرا اور اُن کا سامنا بلاشبہ اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔

''کک..... کون آیا ہے، نویدہ.....؟ تُو کسے اتنے غور سے دیکھے جا رہی ہے؟'' یہ ابا جی کی آواز تھی، ان کی بینائی زیادہ متاثر تھی۔

''بچ..... چشمہ پہن تا جے.....! پھر دیکھ کہ کون آیا ہے!'' ماں جی نے ابا جی سے کہا۔ میرے باپ نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی عینک بھی اُٹھا لی مگر وہ پھر بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔

''شہزی پتر..... اُوراں آ..... وہاں..... کیوں کھڑا ہے..... تُو.....'' ماں نے کہا اور بیڈ سے اُترنے لگیں کہ میں انہیں اس زحمت سے بچانے کی خاطر ان کی جانب لپکا اور بیڈ کے قریب آ کر ان کے پھیلے ہوئے قدموں کے قریب جا بیٹھا اور ان سے لپٹ گیا۔ ماں جی مجھے خود سے لگا کر رو دی۔ میرا باپ ہنوز ہکا بکا سا تھا، شاید کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں۔

ماں کی ممتا بھری چھاؤں تلے آتے ہی جیسے مجھ آبلہ پا آوارہ گرد کو تپتے ریگ زار میں کوئی نخلستان میسر آ گیا ہو..... میرے نادیدہ زخموں پر جیسے مرہم رکھ دیا گیا ہو۔

''تُو بتاتی نہیں نویدہ.....! کون ہے یہ.....؟'' ابا جی کی کپکپاتی آواز میرے کانوں سے پھر ٹکرائی۔ کچھ اندازہ

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

کرنے کی وہ کوشش کر رہے تھے۔

میں دھیرے سے ماں سے الگ ہوا اور باپ کی طرف دیکھا..... جو ایک اچھا شوہر ہی نہیں، ایک پڑھے لکھے باپ ہی نہیں، ملک و قوم کا سچا اور پیارا سپاہی بھی تھا جسے وطنِ عزیز کے ''گمنام سپاہی'' کے اعزاز کا فخر حاصل تھا۔

''ابا جی.....'' میں نے دھیرے سے انہیں پکارا۔

باپ کے جھریوں زدہ چہرے پر جیسے بہت سی لکیریں سمٹ گئیں۔

''تاجے! یہ ہمارا پُتر..... شہزاد احمد خان ہے۔'' ماں کپکپاتے سے لہجے میں بتانے لگی۔

''بتایا تھا میں نے تجھے اس کے بارے میں..... یہ وہ پُتر ہے ہمارا..... جب تُو ایک برستی طوفانی رات میں اپنے وطن کی پکار پر سرحدی چوکی پر چلا گیا تھا۔ ایک پتر وہ تھا جس نے میری اُنگلی پکڑ رکھی تھی، وہ لئیق شاہ تھا..... اور یہ شہزاد احمد وہ تھا جو دنیا میں آنے والا تھا..... کتنے خوش تھے ہم دونوں..... اس کی متوقع آمد پر..... یاد نہیں، ہم نے تو اس کا نام بھی پہلے سے ہی رکھ ڈالا تھا، ہم دونوں میں لڑائی ہوئی تھی، میں چاہتی تھی لڑکی ہو، تم بیٹا چاہتے تھے، میں نے بیٹی کا نام سوچ رکھا تھا اور تم نے بیٹے کا، آخر کار تم جیت گئے تھے، پر میں تمہیں کیسے تمہاری جیت کی خبر سناتی، تم تو..... دور چلے گئے تھے۔ ہاں! تاجے! یہ وہی اپنا شہزی ہے.....! یہی وہ تیرا بہادر گبرو پوت ہے جس نے تجھے دشمنوں کے چنگل سے چھڑایا تھا..... دیکھ لے آج اپنے اس کڑیل جوان پُتر کو.....''

ماں یہ سب کہتے ہوئے جانے کیوں سسک پڑی۔

میرا باپ تو جیسے یک ٹک مجھے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اپنوں کے قریب رہتے ہوئے..... ان سے ماضی کی باتیں کرتے ہوئے، اس کی یادداشت کافی حد تک شاید بحال ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی اپنا چشمہ اُتارتا اور کبھی پہنتا، یہاں تک میں خود ہی اس کے پاس سرک گیا اور لپٹ گیا۔

''ہُوئے ٹھنڈ پے گئی کلیجے وچ..... شہزی پترے.....! واہ میرے مولا!..... یہ کیسا دن دکھا رہا ہے مجھ بڈھے کو..... شکر ہے تیرا میرے مولا! میں تو جوان ہو گیا..... تت..... تُو شہزی پتر ہے ناں.....؟'' ابا جی کے لہجے میں فخر بھی تھا اور انبساط بھی..... ماضی کے گم گشتہ حوالے بھی تھے اور یادِ رفتگاں کے اُن بچھڑے جذبات کے ریلے بھی جنہوں نے کسی بے رحم طوفان کی صورت ہمیں بچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج برسوں بعد ملے تو جیسے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میرا باپ تو جیسے مجھ سے بچوں ہی کی طرح لپٹ گیا۔ وہ بار بار ''میرا پتر..... میرا پُتر.....'' پکارے جا رہا تھا۔ مجھے چوم رہا تھا۔ جب محبت اور شفقت کے ان جذبات کا طوفان تھما تو..... وہ اپنے دونوں بوڑھے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ لیے اماں جی سے بولا۔

''نویدہ.....! دیکھ یہ ہمارے لئیق شاہ سے کتنا ملتا ہے..... کاش! کاش! وہ بھی زندہ ہوتا..... میں دونوں لختِ جگر کو اپنے بازوؤں میں سمو لیتا اور پھر سے جوان ہو جاتا۔''

''میں بھی آپ کا بازو ہوں ابا جی!'' میں نے بھی رقت بھرے لہجے میں باپ سے کہا۔

''ہاں! شہزی پتر! کیوں نہیں..... تُو تو میرا بازو ہی نہیں، میرا فخر بھی ہے، میرا مان بھی۔''

اسی اثنا میں زہرہ بانو، کیپٹن دادا، اول خیر اور شکیلہ بھی اندر آ گئے۔ وہ سب ابا اور اماں جی کے قریب بیٹھ گئے۔ میں اور زہرہ ابا جی کو کیپٹن دادا، اول خیر اور شکیلہ کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کی جاں نثاری اور بے جگر یاری کے قصے بھی سنائے، غرضیکہ وہ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ ابا جی کو جب یہ معلوم ہوا کہ..... انڈیا میں ''را'' کے ایک بڑے اور خطرناک ونگ ''بلیو ٹسی'' جسے را نے خاص طور پر پاکستان میں تخریب کاری اور خفیہ سازشوں کے لیے پروان چڑھایا تھا، میں اسے اس کے سربراہ سمیت نیست و نابود کر آیا تھا۔ تو ابا جی کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا اور بے اختیار اس کے بوڑھے کپکپاتے لبوں سے نکلا تھا۔

''آخر پتر کس کا ہے.....''

''بے شک۔''

وہاں موجود سب کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔

ہم تھکے ہوئے تھے مگر ماں اور ابا جی کے ساتھ دن بھر حتیٰ کہ رات گئے تک ایک چوپال سی ڈالے بیٹھے رہے، کھایا پیا بھی انہی کے پاس بیٹھ کر۔ بزرگوں کی محفل میں ایک عجیب روحانی سکون مل رہا تھا ہم سب کو..... رات کے دو بجے کہیں جا کر سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی اور اگلی صبح دن چڑھے سوتے رہے۔

نہا دھو کر غسل کیا۔ ناشتے کا وقت تو بیت چکا تھا، لہٰذا دوپہر کا کھانا ہی کھایا گیا جو بڑا پُرتکلف تھا۔ زہرہ بانو میری آمد پر بے حد خوش تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہم سے تازہ ترین حالات کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہو۔ اگرچہ ٹیلی فون پر ہماری گفتگو ہوتی رہی تھی، جب میں کراچی میں تھا مگر وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی، لہٰذا

ممکن تھا کہ تشنگی رہ گئی ہو۔ یوں بھی کچھ نئے پلان، کچھ نئی حکمتِ عملی حالاتِ دوراں کی متقاضی تھی۔

کھانے وغیرہ کے بعد ہم پانچوں ایک دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر ہم نے اصل موضوع کی طرف آنے کی غرض سے دانستہ چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کی۔ میرا خیال تھا کہ اب زہرہ بانو شاہ اور وزیرِ جان وغیرہ سے متعلق بات چھیڑے گی مگر جب اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات کا آغاز کیا تو میں حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ وہ نہایت متانت کے ساتھ اور براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

''شہزی! دشمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا سلسلہ چلتا رہے گا، اسی لیے میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت یہاں کے تمام معاملات پسِ پشت ڈال کر ہمیں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے آنسہ خالدہ تھی تو اور بات تھی مگر اب..... اس کی ایک قریبی ساتھی سوزی کے پچھلے دنوں ٹیلی فونک رابطے کے بعد، کہ اب اس کا بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ عابدہ کی رہائی کے لیے باقاعدہ ایک مربوط حکمتِ عملی تیار کر لینی چاہیے۔''

زہرہ بانو نے اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔ عابدہ کے ذکر نے سب کو مغموم سا کر دیا۔ تاہم سب نے زہرہ بانو کی رائے پر صاد کرتے ہوئے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ میرے ساتھ بھی کر چکے تھے۔ اب اس سلسلے میں زہرہ بانو کو بھی سنجیدہ پا کر سب سے پہلے اول خیر نے زہرہ بانو سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے تو ہمارے منہ کی بات چھین لی، وڈے استاد جی (کیپٹن دادا)، شکیلہ اور میں نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی شہزی کو عابدہ بہن کی رہائی کے بارے میں جلد از جلد کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھانے کے لیے زور دیا تھا، پر اسے تو پہلے یہاں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اب جبکہ آپ نے خود بھی اس اہم موضوع کو چھیڑا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت ہو جانی چاہیے۔''

شکیلہ اور کیپٹن دادا نے بھی زہرہ بانو کی بات کی تائید میں اول خیر کی حمایت کر دی تو زہرہ بانو ایک بار پھر سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شہزی؟ ممکن ہے سوزی کے فون کے بعد تم نے اس بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کر رکھا

ستمبر 2017ء کا دلفریب شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مزید

خطوط کی محفل، محفلِ شعر و سخن

اور

مرزا امجد بیگ کا ڈبنگ انداز

ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک پُرفکر داستان

سانحہ

تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے اور منفرد کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر علی اختر کی ایک چونکا دینے والی دلنشین تحریر

باغی

مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی..... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علمِ بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

اکثر لمحات پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر..... کچھ سوغاتیں بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ حسام بٹ کے قلم کی روانی

اس کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، ثمر عباس اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

ہو.....؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

''زہرہ! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جب بھی اس بارے میں سوچتا یا غور کرتا ہوں، تو جانے کیوں میرا دماغ میرا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔ مجھے کوئی راستہ ہی نہیں سجھائی دیتا کہ میں کیا کروں؟ کیسے عابدہ کو امریکا کی خطرناک جیل سے رہائی دلا کر یہاں پاکستان لے آؤں..... مایوسی اور بے بسی حد سے بڑھنے لگتی ہے تو میرا دماغ ماؤف اور دل بجھنے لگتا ہے۔ تب پھر میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ فقط دیواروں سے ہی سر ٹکرانے کو جی کرتا ہے... میرا..... بلکہ..... بلکہ میں تو اب خود کو عابدہ کا مجرم سمجھنے لگا ہوں..... کیا کیا ہے میں نے اب تک اس کے لیے، وہ بے چاری میری خاطر، میرے کہنے پر اس حرافہ عارفہ کے ساتھ انسانی ہمدردی کے طور پر امریکا گئی اور وہاں اسی احسان فراموش عارفہ کی وجہ سے دنیا کی بدنام زمانہ ایجنسی سی آئی اے اور باسکل ہولارڈ جیسے بھیڑیا صفت انسان کے چنگل میں جا پھنسی، یہی سوچ سوچ کر میرے ضمیر کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور میں بے سکون ہی رہتا ہوں.....''

کہتے کہتے میری آواز رُندھ گئی، لب و لہجے میں دکھ سے زیادہ احساسِ ندامت کی کپکپاہٹ عود کر آئی۔

''ریلیکس اِٹ ایزی شہزی!'' زہرہ بانو نے کہتے ہوئے دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ میری کرسی اس کے صوفے کے قریب ہی دھری تھی۔

''میرا مقصد تمہیں دکھی کرنا یا تمہارے زخم ہرے کرنا نہیں تھا، میں چاہتی تھی کہ ہم سب کی توجہ اس ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو جائے تب ہی ہم کوئی لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں اور اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہاری ٹیلی فون پر عابدہ سے متعلق گفتگو، بے قراری اور تشویش کو محسوس کر کے ہی میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس سلسلے میں، میں ہی کیوں نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں.....'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ میں نے قدرے چونکتے ہوئے اور کچھ بے قراری سے اس کی طرف دیکھا بلکہ سب کی یک ٹک سی نظریں زہرہ بانو پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا ٹھہرنے کی خاموشی کے بعد وہ پھر اسی متانت بھرے لہجے میں بولی۔

''پہلے میں اس سلسلے میں ایک امیگریشن ویزا کنسلٹنٹ سے امریکا وزٹ ویزا پروگرام کے بارے میں ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ شہزی سمیت ہمارا امریکا وزٹ ویزا ممکن ہے کہ اول تو مسترد کر دیا جائے گا، کیونکہ آج کل نائن الیون کی وجہ سے امریکی ویزا پالیسی مسلمانوں، بالخصوص پاکستانیوں کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہے، دوسری بات میرے ذہن میں یہ آئی تھی کہ اس طرح اگر وزٹ ویزا مل بھی جاتا ہے تو ہماری، بالخصوص شہزی کی اصل شناخت ظاہر ہو جاتی، جبکہ میں اس مہم کو خفیہ رکھنا چاہتی ہوں، لہٰذا میں نے امیگریشن اینڈ ویزا کنسلٹنٹ سے بات کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور اس کے متبادل کسی اور راستے پر غور کرنے لگی تو میرے ذہن میں ایک شخص زور آور خان کا نام آیا۔ وہ کسی ریکروٹنگ اینڈ ٹریولنگ ایجنسی سے وابستہ رہ چکا ہے۔ جعلی کام بھی جینوئن طریقے سے کرتا ہے، اس کا پروسس بھی شارٹ ہے، راستوں کی آسانی بھی خود ہی بتاتا ہے۔ بس، شرط یہ ہے کہ اُسے اصل قصہ کچھ بتانا پڑتا ہے، جو وہ راز میں ہی رکھتا ہے، کیونکہ اُسے کسی کے رازوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، ہاں! پیسے وہ منہ مانگے مانگتا ہے، پر اس کے کام میں پرفیکشن ہے۔ اگر تم لوگوں کو یہ تجویز پسند ہے تو مجھے بتا دو، میں اس سے رابطہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گی، بلکہ اُسے اِدھر ہی بلوا لوں گی۔''

زہرہ بانو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ سب میری طرف دیکھنے لگے، جبکہ میرے پاس سوچنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔

''اگر ایسا کوئی آدمی ہے جو مجھے ایک بار امریکا پہنچا دے تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ آگے میں جانوں اور میرا کام.....''

''اوخیر..... کاکے! تُو تو ایک دم دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگا.....'' اول خیر میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کشتیاں جلا کے آگ کے ایک ایسے سمندر میں کودنے کے مترادف ہوگا جہاں واپسی کا راستہ تو درکنار راستے ہی میں خدانخواستہ ڈوب جانے کا پورا پورا خطرہ موجود رہے گا۔''

''خطرناک کام میں خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔'' زہرہ بانو نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ''اور پھر شہزی اکیلا کب ہوگا؟ ہم سب اس کے ساتھ ہوں گے۔''

''یہ ناممکن ہے، کہ سب ہی اس خطرناک مشن میں کمربستہ ہو جائیں۔'' میں نے فوراً زہرہ بانو کی بات رد کر دی۔ ''ابھی صرف میرے اکیلے کا ہی امریکا جانا مناسب اور نسبتاً زیادہ آسان ہوگا.....'' میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''زہرہ! تم آج ہی زور آور خان کو اِدھر بلوا لو..... اس سے بات تو کر کے دیکھ لیں۔''

''لیکن اس سے بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ ڈیسائڈ کر لینا چاہیے کہ اس سے کتنے آدمیوں کی روانگی کی بات کی جائے؟'' زہرہ بولی تو کمیل داد! بولا۔

''بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ شہزی صحیح کہہ رہا ہے۔ یہاں بھی تو کسی کو رہنا ہوگا، اسی لیے سب کا جانا مناسب نہ ہو گا اور اس طرح کام بننے میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے، صرف میں شہزی کے ساتھ امریکا جاؤں گا۔''

''نہیں کمیل داد!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر انکار میں سر ہلایا۔ ''تمہارا یہاں موجود رہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ بیگم صاحبہ کو تمہاری ضرورت ہوگی، انہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر ماں جی اور ابا جی بھی ہیں۔ دشمن گھات میں اور مات دینے کی تاک میں ہیں۔ میرے ساتھ ابھی کوئی نہیں جائے گا۔ میرے اکیلے جانے کے سلسلے کے کام میں تاخیر بھی نہیں ہوگی اور میں آزادی سے اپنا کام بھی کر سکوں گا۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' اس کے بعد میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کے بولا۔

''زہرہ! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے عابدہ اور میرے متعلق اس طرح نیک نیتی اور پورے خلوص کے ساتھ سوچا۔ ایک احسان اور کر دو..... میرا جلد سے جلد امریکا جانے کا بندوبست کر دو..... بس! ایک بار میں امریکا پہنچ جاؤں..... عابدہ کے ساتھ ہی انشاء اللہ لوٹ کے آؤں گا۔'' میرے لہجے کا استحکام میری پُرجوش آواز سے مترشح ہوتا تھا مگر میری بات پر سب پریشان ہو گئے۔ تب ہی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی! یہ سرحد پار انڈیا کا معاملہ نہیں ہے کہ ایک باؤں ادھر پڑا اور اپنے ملک میں آ گئے۔ یہ سات سمندر پار یک اور برِاعظم جانے کا معاملہ ہے اور ملک بھی کیسا جہاں تمہارے خلاف پہلے ہی باسکل ہولارڈ، ٹائیگر فیگ (سی آئی اے)، اور اسپیکٹرم اور لولوش جیسے خطرناک بین الاقوامی دشمن دانت تیز کیے بیٹھے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہوگا کہ تم عابدہ کو چھڑانے کے لیے کوئی ایسا قدم ضرور اُٹھاؤ گے..... اس لیے بہتر ہوگا کہ تم کم از کم مجھے اور اول خیر کو اپنے ساتھ ضرور لے جاؤ۔''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے دور دراز ملک ں، صرف میرا جانا ہی زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس رح کی مہمات میں اکثر ساتھی بھی پیروں کی زنجیر بن جایا رتے ہیں، تم سب میری اور عابدہ کی کامیابی کی دعا مانگتے

رہنا..... اور بس، یہی میرے لیے تمہاری مدد بہت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

میرے فیصلے سے سب کے چہرے اُتر سے گئے، بالخصوص اول خیر اُداس ہو گیا بلکہ اس کا منہ بن گیا تھا۔

''چنگی یاریاں نبھایاں تو یارا.....! بھلا تیرے بغیر میرا دل یہاں کیسے لگے گا۔ یہ بھی سوچا تو نے..... کاکے!''

ایک تنہا موقع پر اس نے مجھ سے گلے شکوے شروع کر دیے اور من بھر کا بوتھا سُجا لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور بولا۔ ''یار! تُو بھی جھلا ہے بالکل..... سمجھتا نہیں ہے۔ میں اکیلا اس اہم مشن میں بہت ہلکا محسوس کروں گا، اور یہ مشن ہے بھی اسی کا متقاضی، پھر تم سب یہاں ہو گے تو مجھے بھی تسلی رہے گی، اگر خدانخواستہ میں وہاں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو تم سب لوگ ہو ناں، کیا میری مدد نہیں کرو گے.....؟''

''اوخیر..... کاکے! ابھی تو اتنا سیانا نہیں ہوا ہے کہ یاروں کو بہلا لے.....'' اول خیر اسی سوجے ہوئے منہ سے بولا۔

''مجھے پتا تھا تم اِدھر ہی ہو گے..... شہزی کی منتیں کرنے کے لیے..... بڑا شوق ہے ناں تمہیں گوریاں دیکھنے کا.....''

میں اور اول خیر دونوں ہی اس آواز پر چونکے تھے، پلٹ کر دیکھا تو شکیلہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اول خیر کو اس کی طرف سے ''چوٹ'' پڑی تو وہ منہ بنا کر بولا۔

''دخل در معقولات کی معذرت کیے بغیر یوں اندر چلے آنا خلافِ آداب ہوتا ہے محترمہ! اور خیر سے تمہیں اخلاقیات تو چھو کر بھی نہیں گزریں..... تو اب کیا کہا جائے۔''

چڑنے کے بجائے شکیلہ نے یوں اپنا منہ ہونٹوں تلے دبایا تھا جیسے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی ہو، یہ بھی دوسرے کو چڑانے کا ایک انداز تھا۔ یہی سبب تھا کہ اول خیر کی برہمی کم نہیں ہوئی اور وہ دوبارہ بولا۔

''اور..... یہ آپ کیا فرما رہی ہو کہ میں شہزی کے ساتھ محض امریکا گوریاں دیکھنے جا رہا ہوں..... شرم آتی ہے مجھے تمہاری اس لغو گوئی پر..... اطلاعاً بتا دوں کہ امریکا گوریوں کا نہیں کالیوں کا ملک ہے۔''

''وہاں گوریاں بھی ہیں اور گورے بھی.....'' شکیلہ فوراً بولی۔

''تمہارے جیسی گوریاں ہوں گی، باہر سے سفید اندر

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

سے کالی۔'' اول خیر کہاں چپ رہنے والا تھا۔

''آؤ شکیلہ! بیٹھو۔'' میں نے بڑی مشکل سے سنجیدگی کی آڑ میں اپنی ہنسی کو چھپانے کی کوشش چاہی تھی، ورنہ اول خیر ہمیشہ کی طرح شکیلہ کو سر چڑھانے کا الزام میرے سر تھوپ دیتا۔

''شکریہ شہزی!'' شکیلہ مسکرائی اور ہمارے قریب ایک صوفے پر براجمان ہوگئی۔

''اب تم ہی اِسے سمجھاؤ، بچوں کی طرح ضد کر رہا ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔'' بالآخر میں نے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اوخیر..... کاکے! اب ہمارے بارے میں اس کم عقل سے مشورہ لیا جائے گا۔'' اول خیر نے منہ بنایا مگر میں نے دیکھا اس بار شکیلہ بھی ذرا متانت سے بولی۔

''شہزی! میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم تم اول خیر اور مجھے ہی اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ آخر کو ہم نے بھی تمہارے ساتھ ہی کمانڈو ٹریننگ لے رکھی ہے پھر یہ مشن بھی اہم ہے۔ کیا تمہیں ہماری کارکردگی پر کوئی شبہ ہے؟''

شکیلہ کو یہ بات کرتے دیکھ کر اول خیر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

میری امریکا روانگی سے متعلق میرے جاں نثار ساتھیوں کی سوئیاں ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھیں کہ مجھے اکیلے اتنے بڑے اور اہم مشن پر امریکا جیسی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

بڑی بحث کے بعد بالآخر میں انہیں اس وعدے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ..... مجھے جیسے ہی کسی ساتھی اور مدد کی ضرورت پڑے گی، میں سب سے پہلے اول خیر اور شکیلہ کو ہی بلاؤں گا۔ زہرہ بانو کے کان میں یہ بات پڑی تو اس کا پہلا مشورہ یہی تھا کہ وہ زور آور خان سے مزید دو افراد کی متوقع روانگی کے سلسلے میں بھی بات کرے گی۔ میرے ساتھیوں نے دوسرا وعدہ مجھ سے یہ لیا تھا کہ میں مناسب موقع پر اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتا رہوں گا۔

دو روز آرام اور اسی بحث میں لگ گئے تھے، جبکہ مجھے یہاں میجر وسیم کی نصیحت کے مطابق رینجرز فورس کے ملتان کور (corps) ہیڈ کوارٹر جا کر لیفٹیننٹ کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ یہ میجر ریاض کی جگہ تعینات کیے گئے تھے اور انہی کی سرکردگی میں بیگم ولا میں ریڈ لگایا گیا تھا اور زہرہ بانو سے سختی کے ساتھ ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی، لیکن جب زہرہ بانو نے انہیں اصل حقیقت اور میجر ریاض کے حوالوں کے ساتھ انہیں آگاہ کیا تھا تو ان کی جان چھوٹی تھی۔ نوشابہ کی ایک حد تک انہیں ہمارے خلاف گمراہ کرنے کی سازش تو کامیاب رہی تھی، مگر یہ زیادہ دیر نہ چل سکی تھی۔ تاہم اس نے پریس کانفرنس میں ہمارے بارے میں بہت کچھ غلط کہا تھا۔ اور اخبارات نے بھی اس کی باتوں کو اچھالا تھا۔

یہ اخباری تراشے زہرہ بانو نے ایک رجسٹر میں چسپاں کر کے بہ طور ریکارڈ محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ تراشے اور اخبارات، ان پر کالم نویسوں کے تجزیے میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے تھے۔ میں اب کہہ سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیسا ''اسٹینڈ'' لینا تھا۔

امریکا جانے سے پہلے پہلے میں بیگم ولا کو خطرہ پروف بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے لیے میں نے دشمنوں کو اسی کے ہر ہتھیار سے جواب دینے کا سوچا۔ اگلے دن ہی بیگم ولا میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔

وہاں میں نے علی الاعلان طلسم نور ہیرے کا انکشاف اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کی کوششوں کا بھی ذکر کر دیا اور ساتھ ہی اخلاقی طور پر اس کا کریڈٹ مرحوم بشام چھلگری کے سر کرنے کا بھی باضابطہ طور پر اعلان کیا۔ اس کے بعد میں نے آخر میں چوہدری ممتاز اور بالخصوص نوشابہ کے سابقہ بیانات کے حوالے سے بھی بات کی اور ساتھ ہی دشمنوں اور بالخصوص نوشابہ کو دھمکانے اور بے چین کرنے کی غرض سے اپنے ان عزائم کا بھی ذکر کر ڈالا کہ چوہدری ممتاز خان کسی طور پر بھی رہائی اور ضمانت کا مستحق نہیں۔ اُسے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندر داس سکسینہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والے ایک فعال ادارے نے میرے ساتھ اُسے ایک کمبائنڈ آپریشن میں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ وزیر جان کا بھی ذکر ہوا، میجر ریاض کا بھی بعض مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کر ڈالا۔ تاہم اس میں، میں نے بلیو ٹسی اور انڈیمان مہمات کا کوئی ذکر نہ کیا بجز اس کے کہ اشارتی زبان کا ہی سہارا لے کر یہ بتانے کی کوشش ضرور چاہی کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کس طرح یہ مہم جان پر کھیل کر سر کی تھی۔ اگر نوشابہ..... نے اپنی گزشتہ کانفرنس میں میرے، زہرہ بانو، بیگم ولا اور میرے باپ کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کی ہوتی تو میں بھی یہ جوابی کانفرنس نہ کرتا مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔

بہرکیف میری یہ دھواں دھار پریس کانفرنس خاصی

تہلکہ خیز رہی۔ اس پریس کانفرنس کا فیصلہ میں نے اچانک اور بذکورہ اخباری تراشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا تھا۔ یوں اب اس کے بعد مجھے کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

سب سے پہلا فون میرے پاس خان جی کا آیا تھا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''برخوردار! میری تو آنکھیں چندھیا گئیں تمہارے انتظار میں..... ابھی ٹی وی پر تمہاری پریس کانفرنس دیکھی تو دل خوش ہو گیا۔ تم نے آتے ہی دشمنوں کے دانت کھٹے کرنا شروع کر دیے۔ تم سے کیسے ملا جائے؟''

وہ خاصے پُرجوش تھے۔ میں نے کہا۔ ''خان صاحب.....''

''اُونہہ..... نو خان صاحب! میں تمہیں برخوردار کہہ رہا ہوں تم.....'' اُنہوں نے میری بات کاٹی۔ ''صرف انکل کہو.....''

''جی انکل! آپ کی محبت ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے کہیں ضروری کام سے منظر نامے سے غائب تھا۔''

''یہ سب جان چکے ہیں، تمہاری پریس کانفرنس میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ تم سے ملاکب اور کیسے جائے؟''

''میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کے پاس خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔''

''وعدہ.....؟''

''وعدہ۔''

''جیتے رہو، میں بے چینی سے تمہارا انتظار رہوں گا۔''

چند دنوں بعد بین الاقوامی نمائش میں باضابطہ سرکاری طور پر طلسم نور ہیرے کا ذکر کر دیا گیا۔ یہ نمائش اسلام آباد میں ہوئی تھی اور مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

اس کے بعد..... بیگم ولا، بیگم صاحبہ اور میری ملک گیر شہرت نے اسے ملکی احترام کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ بیگم ولا اور ہماری ایسی ساکھ قائم ہو جائے جس کے بعد کسی کو ہم پر پروپیگنڈا کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے۔

میرے اس عمل سے زہرہ بانو بہت زیادہ مطمئن اور خوش ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے میری ذہنی فراست اور چابک دستی کی داد بھی دی۔

''شہزی! تم ایک دم پرفیکٹ آدمی ہو..... کس وقت کیا کرنا اور بعد میں کس کام کو طول دینا ہے، اس میں تو تم گویا یدِطولیٰ رکھتے ہو۔'' میں کیا جواب دیتا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

زور آور خان..... زہرہ بانو کی ایک ہی ٹیلی فونک کال پہ بیگم ولا آ گیا تھا۔

وہ ایک عمر رسیدہ اور چرب زبان آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور جسم فربہی مائل تھا۔ منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی، تھیلا نما پتلون اور اسی طرح کی ٹینکنی کلر شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ آدھا سر گنجا تھا اور باقی نصف پر جو بال تھے وہ ازراہِ زحمت ہی نظر آتے تھے۔ یعنی اُڑے اُڑے اور خشک سے۔ اس کی بائیں کلائی پر سنہری گھڑی تھی جو خاصی قیمتی نظر آتی تھی۔ گلے میں طلائی چین تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا، گاڑی کی چابیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا اور ہم سب ہی وہاں موجود تھے۔ چائے وغیرہ کی ٹرالی درمیان میں سجی تھی اور وہ بسکٹ اور نمکو چبانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

بظاہر تو مجھے اسے دیکھ کر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ خود اس نے مشکل سے ہی کراچی کا سمندر دیکھا ہوگا نجانے دوسروں کو کس طرح اس نے سات سمندر پار لگایا ہوگا۔

زہرہ بانو نے اس دوران میں اسے میری ''ٹرم اینڈ کنڈیشن'' کے طور پر بتا دیا تھا کہ میں نہ تو مستقل طور پر امریکا رہائش اختیار کرنے کے مقصد سے جا رہا تھا نہ ہی گھومنے پھرنے کے لیے..... بس ایک ضروری کام نمٹانا تھا اور کسی کو تلاش کر کے اسے لے کر واپس لوٹنا تھا۔

''ہا..... ہا.....'' اس نے یہ سب سننے کے بعد اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سا قہقہہ اُگلا۔

''سیدھی طرح کہو ناں بیگم صاحبہ! مال کھپانا ہے اور ڈالر جیب میں رکھ کے لوٹ آنا ہے۔''

''تمہارا خیال ہے ہم تمہیں اسمگلر نظر آتے ہیں؟'' زہرہ بانو نے اسے گھورا..... تو وہ ایک دم خفیف سا ہو گیا پھر کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''آپ تو سنجیدہ ہو گئیں بیگم صاحبہ! میں تو مذاق کر رہا تھا، ویسے کھپنی کو اسمگلر نہیں کہتے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، اب تم ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تو کام کی بات کر لی جائے۔'' زہرہ بانو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ وہ خاصا ہنسوڑ تھا اور زہرہ بانو کا منہ چڑھا بھی۔ نجانے زہرہ بانو نے ایسے اور کتنے مجوبے اپنی پٹاری میں بند کر

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

رکھے تھے۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کتنے دانے پار لگانے ہیں؟''

''تین۔'' زہرہ بانو نے بتایا اور میں چونکا مگر چپ رہا۔ اول خیر وغیرہ بھی ضرور زہرہ بانو کے اس جواب پر چونکے ہوں گے۔

''لگ جائیں گے۔''

''کام محفوظ اور خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے۔''

''یہ کام ہے ہی ایسا کہ اسی طرح کیا جائے۔'' اس نے کہا اور سگریٹ کا ایک اور کش لگا کر چٹکی بجائی۔ وہ سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر پینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

''آدمی کم یا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں مگر ویزا کم از کم سال سے چھ ماہ کا ہونا چاہیے۔'' زہرہ بانو نے کہا اور کچھ سمجھ کر میرے حلق سے ایک ہلکی سی ہنکاری خارج ہوئی تھی۔

''سال بہت ہے، چھ ماہ کا ویزا حاصل کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا، ترنت کام چاہیے تو تین ماہ.....'' وہ ٹھیٹ لین دین والے لہجے میں بولا۔

''تین ماہ تو بہت کم ہیں.....'' زہرہ بانو نے قدرے تفکر سے دیکھا۔

''ارے بیگم صاحبہ! تین ماہ کا بھی مل جائے تو ڈھول نفیریاں بجانا۔ کیا بھتی ہو، امریکا کا ویزا اور تین ماہ، یہاں تو لوگ کہتے ہیں کہ پندرہ دن کا بھی مل جائے تو بہت ہے، بس ایک بار باہر نکل جائیں، آگے سو بہانے مل جاتے ہیں پاؤں ٹکانے کے.....''

''ہم ایسا کچھ نہیں کرنے جا رہے ہیں۔'' زہرہ بانو نے کہا۔ ''ہمیں جانا ہے اور اپنا کام نمٹا کر لوٹ آنا ہے اور بس.....''

''فی دانہ..... پچیس لاکھ ہوگا، تین آدمی مانو، پچھتر لاکھ، بیچ کا خرچہ بھی تمہارے ذمے..... آدھی رقم ایڈوانس لوں گا، باقی یہاں سے فلائی کرتے ہی.....'' وہ فوراً اپنے مقصد کی بات پر آ گیا۔

''فی آدمی پچیس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔'' زہرہ بانو نے کہا۔ ''یہ تو تم اُن لوگوں کا ریٹ بتا رہے ہو، جنہوں نے واپس لوٹنا ہی نہیں ہوتا۔''

''لوٹ آؤ یا وہیں رہو، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔'' وہ سگریٹ دبی مٹھی کا سوٹا بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! پھر فی دانہ پانچ لاکھ دے دو اور تینوں کو کنٹینر میں ڈال کر روانہ کر دوں گا، پندرہ لاکھ، کام پکا۔''

کنٹینر کے ذکر پر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آ گئی۔ کیونکہ پرانے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسی اندوہناک خبر بھی میری نظروں سے گزری تھی کہ ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ لوگ کنٹینر کے ذریعے بیرونِ ملک سپلائی کیے گئے تھے مگر بدقسمتی سے راستے ہی میں حبسِ دم کا شکار ہو کر بڑی بے بسی اور اذیت ناک موت کا شکار ہو گئے تھے۔

''ہرگز نہیں.....'' زہرہ بانو نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ ''پیسے تمہیں پورے مل جائیں گے مگر کام پکا ہونا چاہیے..... پلان کیا ہوگا تمہارا.....؟''

''اب کی ناں آپ نے سمجھداری والی بات۔'' وہ چہک کر بولا۔ ''آپ سے میری... جمعہ جمعہ آٹھ دن کی واقف کاری تو نہیں ہے ناں..... بیگم صاحبہ! میرے پلان کا بھی آپ کو اندازہ ہے اور کام کا بھی..... بڑے سچل طریقے سے کام کرتا ہوں..... سنو گی تو چک اُٹھو گی۔ اب بتاؤ، ان میں سے کون سے وہ دانے ہیں، جنہیں پار لگانا ہے تو پھر میں آپ کو اپنا پلان بتاتا ہوں.....'' کہتے ہوئے وہ ہماری طرف باری باری گھورنے لگا۔

اس کا لہجہ مجھے ہی نہیں اول خیر وغیرہ کے لیے بھی سخت ذہنی کوفت کا باعث بن رہا تھا، مگر اس کی عادت اور اپنی مجبوری جان کر ہم برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

''یہ تینوں ہیں۔'' زہرہ بانو نے شکیلہ، اول خیر اور میری طرف اشارہ کیا۔

وہ ہماری طرف تھوڑی دیر تک گھورتا رہا پھر مسکرا دیا۔ ہم سنجیدہ ہی رہے۔

وہ پھر زہرہ بانو سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تو پھر ڈن.....؟''

''پلان بتاؤ.....؟''

اس نے جواباً ایک لمبی سانس کھینچی، سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔ اس کے بعد بولا۔ ''ان تینوں کا گیٹ اَپ چینج کرنا پڑے گا۔ میرے پاس تین جینوئن افراد کے پاسپورٹ اور ویزے تیار ہیں مگر وہ تینوں بھارتی نژاد ہندو ہیں۔ دو میاں بیوی اور ایک..... فلاپ شدہ اداکار ہوگا۔ وہ تنہا تھائی لینڈ کے راستے نکلے گا، اور ہالی وڈ قسمت آزمائی کے لیے جائے گا۔ چاہے کیسا ہی رول مل جائے۔ جبکہ میاں بیوی دبئی کے راستے روانہ ہوں گے، اپنے ایک عزیز کی اسپانسر شپ پر جو سان ڈیاگو کی ایک ساحلی بستی کے کنارے آباد ہیں۔ اب آپ بتائیں، کیا زیادہ ہیں فی دانہ پچیس لاکھ بیگم صاحبہ؟ بالکل تیار اور سمجھو تو طے شدہ کام ہے۔''

اس کے منصوبے کو چند لفظوں میں سن کر ایک لمحے کو میں خود بھی متحیر رہ گیا۔ آدمی مجھے واقعی چلتا پرزہ لگا تھا۔

''آج کل کے حالات کا تو آپ سب کو علم ہوگا ہی کہ نائن الیون کے بعد امریکا کو ایک آسیب کھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ویزا پالیسی کس قدر مشکل کر دی گئی ہے، مسلم تو ایک طرف، پاکستانی تک کے ذکر پر ہی..... سو طرح کے آبجیکشن لگا کر کیس ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے۔ میں نے ان ساری باتوں کو دیکھ کر ہی منصوبہ پلان کیا ہے، یعنی جعل سازی کی آڑ میں جینوئن کام..... اور جینوئن کام بھی کیسا.....'' وہ چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے آگے بولا۔ ''یہ تینوں مذکورہ افراد مر چکے ہیں، مگر ان کا نہ کوئی ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے نہ ہی کوئی اور ایسی دستاویز یا ثبوت.....''

''لیکن..... بھیس بھرنے کا یہ عمل پکڑوا سکتا ہے۔'' میں نے اعتراض اُٹھایا۔ ''اسکیننگ ہو سکتی ہے ہمارے چہروں کی.....''

''ارے بھائی! میں کیا تمہارے چہروں پہ..... عورتوں یا بیوٹی پارلروں والا میک اَپ کروں گا.....'' زور آور خان ہنس کر بولا۔ ''اس کام میں، میں اکیلا نہیں ہوں..... میرے ساتھ ہر قسم کے ایکسپرٹیز کی پوری ٹیم موجود ہے، پورا ٹیم ورک ہوتا ہے ہمارا..... اسی لیے تو یہ کہانی ہزاروں کے بجائے لاکھوں پر ہوتی ہے..... ڈاکٹرز، پلاسٹک سرجن، دیگر ماہرین..... اور بولو..... ہاں! یہ میک اَپ جتنا جاندار ہوگا اُتنا ہی ناپائدار بھی..... جو سچی بات تھی، میں نے کہہ دی۔''

میں نے بھویں سکیڑ لیں۔ زہرہ بانو نے بھی چونک کر پوچھا۔

''کیا مطلب.....؟''

''صاف بات ہے، میک اَپ اپنا کام ایک محدود حد تک کرے گا، اس کے بعد یہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ ماسک اور فیشل میک اَپ ہوگا۔ سپر فیشل.....''

''گویا یہ میک اَپ چند دنوں بعد خود ہی صاف ہو جائے گا؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''لیکن..... تم اسی شکل اور نام کے ساتھ دوبارہ ریڈی میڈ میک اَپ کر سکتے ہو..... تب تک تم امریکا کی سرزمین میں قدم رکھ چکے ہو گے، پھر کیا پروا ہوگی..... آگے تمہارا مسئلہ ہے..... میرا کام تم تینوں کو وہاں پہنچا دینا ہے۔ اب تم یہ کہو کہ وہاں دال روٹی کا بھی میں ہی بندوبست کروں تو یہ ناممکن ہے۔''

میں اور زہرہ بانو، سوچتی نگاہوں سے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ہمیں ایک پُرسوچ سی اُلجھن آمیز سوچ میں نگاہیں ملاتے دیکھ کر زور آور خان ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ہر کام میں رسک تو ہوتا ہی ہے، کوئی کام پرفیکٹ نہیں ہوتا دنیا میں، تمہیں چیک کرنے والے بھی پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کل سخت چیکنگ صرف مسلم اور پاکستانی مسلم کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے، عام لوگ اس سے مبرا ہیں..... بالخصوص انڈین ہندو..... اور تم تینوں ہندوؤں کے بھیس میں جاؤ گے تمہیں تمہارے جعلی ہندو نام بھی بتا دیے جائیں گے..... بس! اب اس سے زیادہ میں تمہیں مطمئن نہیں کر سکتا، سودا پھینکو اور بات آگے بڑھے.....'' وہ آخر میں ٹھیٹ کاروباری لہجے میں بول کر چپ ہو گیا۔

اس کی بات میں کافی وزن تھا۔

''ہم.....'' زہرہ بانو نے ایک خیال انگیز سی ہنکاری خارج کی اور اسی انداز میں میری طرف ایک ذرا نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر زور آور خان سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تمہیں کب تک فائنل جواب چاہیے؟'' زور آور نے اپنی گولڈن کلر کی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور بولا۔ ''ابھی چھ بج رہے ہیں..... یہ شام اور رات کافی ہے سوچنے کے لیے، صبح تک مجھے ڈن کر کے بتا دو..... تاکہ میں کل سے ہی کام کی ابتدا کر دوں، اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اس لیے نصف ایڈوانس رقم آپ کے فائنل جواب کے ساتھ مجھے چاہیے.....'' اس نے پکے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے..... کل صبح تک تمہیں فائنل جواب کے ساتھ رقم کا چیک بھی مل جائے گا۔''

''سوری بیگم صاحبہ! چیک نہیں، ڈائریکٹ کیش چلے گا.....'' اس نے شہادت کی اُنگلی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک دم اتنی رقم..... بینک والے.....'' زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے، منیجر سے میری واقفیت تو ہے، ممکن ہے کام ہو جائے۔''

''کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ دو ایک روز اُوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔'' زور آور بولا۔

اس کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔

''می می..... یہ دونوں کب میرے ساتھ جا رہے

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

ہیں.....؟'' میں نے گویا چونکتے ہی زہرہ بانو سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی کے آثار تھے جبکہ شکیلہ اور اول خیر خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے، خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زہرہ بانو..... کیا واقعی..... ان دونوں کو بھی میرے ساتھ روانگی کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی یا یونہی اس نے کہہ دیا تھا۔

''شہزی! تمہاری یہی بحث تھی ناں کہ ایک آدمی کا کام نسبتاً آسان اور اس سے زائد کا مشکل ہوسکتا ہے، دیکھ لو..... تم تینوں کا کام پکا ہے۔''

''مگر.....'' میں نے کہنا چاہا۔

''دیکھو شہزی.....'' زہرہ بانو نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے اور کمیل دادا نے ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ..... اگر تینوں کا کام آسان ہورہا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں..... اول خیر اور شکیلہ تمہارے ٹریننگ پارٹنر بھی رہ چکے ہیں..... تم تینوں کمانڈو ایجنٹ ہو..... امریکا میں تم عابدہ کا کوئی قانونی یا عدالتی کیس لڑنے نہیں بلکہ فائٹ کرنے جارہے ہو..... وہ بھی عام لوگوں سے نہیں..... سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر فورس'' سے فائٹ لڑنے..... کورکوران کی جیل، بین الاقوامی دشمنوں کی کچہار میں گھس کر تمہیں ان سے نبرد آزما ہونا بھی پڑے گا۔ تنہا اتنا بڑا رسک غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا، جس میں ناکامی کی صورت میں..... عابدہ کی جان اور اس کے تحفظات کو مزید خطرات لاحق ہوجائیں گے.....'' وہ ایک ثانیے کے لیے سانس لینے کو رکی پھر دوبارہ بولی۔

''پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہارے جاتے ہی، خاموشی سے اول خیر اور شکیلہ کو بھی بھیج دوں..... جس طرح میں نے تمہاری انڈیا والی مہم میں کیا تھا، مگر اس بار بات اور تھی..... پلیز..... شہزی! یہ ضروری ہے..... وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ ایک سے دو بھلے.....''

میں نے سر جھکا دیا۔ اول خیر نے خوشی سے نعرہ بلند کیا تھا۔ شکیلہ بھی خوش تھی۔

زہرہ بانو میرا مزاج اور طبیعت کو سمجھنے لگی تھی۔ میں جو کہتا یا جس بات پر اڑ جاتا، وہ بظاہر اثبات میں اپنا سر ہلا کر خاموش ہو جاتی تھی مگر کرتی وہی تھی جو اس کی مرضی اور میرے مفاد میں ہوتا تھا۔ نجانے پھر کیا ہوتا کہ میں بھی انکار نہیں کر پاتا تھا۔

زور آور خان کو صبح تک بتا دیا گیا تو اس نے کچھ طبع شدہ فارم بھجوا دیے جنہیں ہم تینوں نے ضروری خانہ پُری کر کے اس کے آدمی کو دے کر روانہ کر دیے جو ساتھ لایا تھا۔ اس نے دو سے چار ہفتوں کا وقت مانگا تھا۔ کام تیار ہونے کے باوجود یہ ایک بڑا عرصہ تھا مگر ہم کیا کر سکتے تھے، سوائے انتظار کے۔

اگلے روز میں، شکیلہ اور اول خیر، کرنل ریاض کی رہائش گاہ پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئے اور بڑے پُرتپاک انداز میں ملے۔ وہ عام سی گھریلو شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ واقعی مکمل طور پر ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ایک آرام دہ اور خوب صورت نشست گاہ میں بٹھایا، ان کا وہ بیٹا بھی ہم سے ملا تھا جو اب ماشاء اللہ کافی بڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا، جسے میں نے دشمنوں کے نرغے سے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں حملے کے بعد اپنی جان پہ کھیل کر بچایا تھا۔ ان کی بیگم بھی ہم سے ملیں۔

ریاض صاحب نے سب سے پہلے تو میری پریس کانفرنس اور مجھے ملنے والے ملکی اعزاز کے بارے میں توصیفی کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد مجھ سے بھارتی مہم جوئی اور بلیو ٹمسی کے خاتمے وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں انڈیمان تک سارے سنسنی خیز حالات و واقعات بتا دیے۔ جسے سن کر وہ بہت حیران اور ششدر ہوئے۔

''کاش! شہزی! میں تمہیں پاک آرمی میں کوئی اچھا اور بڑا عہدہ دلوا دیتا۔ آرمی میں ایسے عہدے موجود ہیں جو محض اس طرح کی کارکردگی کی بنیاد پر بھی آنریری تفویض کر دیے جاتے ہیں۔'' انہوں نے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

''جی ہاں! میری اور میرے ان دونوں ساتھیوں کی پاور ایجنٹ کی حیثیت سے شمولیت اس کی مثال ہے۔'' میرا اشارہ اول خیر اور شکیلہ کی طرف تھا۔

''کاش! یہ ڈراپ نہ ہوتی۔'' انہوں نے ایک حسرت زدہ سی سانس خارج کی۔

''مجھے عہدے کا کوئی لالچ نہیں سر!'' میں نے کہا۔ ''میں اب بھی خود کو وطنِ عزیز کا ایک ادنیٰ سپاہی سمجھتا ہوں.....''

''آخر ایک گمنام سرفروش سپاہی کے بیٹے جو ہوئے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ان کے لہجے میں فخر تھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

''سر! آپ سے چوہدری ممتاز کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔'' بالآخر میں اصل موضوع کی طرف آتے

ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے رہائی کیسے مل گئی۔''

''مجھے تم سے اسی سوال کی توقع تھی۔'' وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولے۔

''سر! آپ خود اندازہ لگائیں، ہم سب نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر اسے گرفت میں لیا تھا جبکہ وزیر جان کے کامیاب فرار پر مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے۔ تو یہ سب کیسے ہو گیا؟''

''بالکل اسی طرح برخوردار! جیسے پاور جیسے ونگ کو معطل ختم کرنا پڑا۔''

''میں سمجھا نہیں سر! وہ تو ایک دوسرا معاملہ تھا۔ ہم اسے خفیہ نہ رکھ سکے تھے اور اس ونگ کی بنیاد ہی اسی پر تھی جو قائم نہ رہ پائی اور.....'' میں..... دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر فوراً بعد دوبارہ بولا۔ ''..... چوہدری ممتاز والا معاملہ اور تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں.....''

''شہزی!'' ریاض صاحب نے میری بات کاٹی اور میں خاموش ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگا۔

''گندی مکھی جب بھی گندگی پر بیٹھتی ہے تو اپنا ایک پَر بچا کے بیٹھتی ہے۔ اسی طرح ممتاز خان جیسے سیاست دان کرتے ہیں، وہ چاہے جتنا بھی گندگی میں لتھڑ جائیں، اپنا ایک پہلو ہمیشہ بچا کر رکھتے ہیں اور وہ ہوتا ہے ان کا دوسرا چہرہ..... جو سامنے ہوتا ہے، ہمارے آگے نہیں، اپنی اس عوام کے آگے جنہیں یہ بے وقوف بناتے ہیں اور پھر انہی کے کاندھوں پر بندوق رکھ کے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے سامنے مظلوم بنتے ہیں، دہائیاں دیتے ہیں، فریادیں کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ووٹ لینے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں، بڑے بڑے ملکی مسائل کو حکومت میں آنے کے بعد ہفتوں میں بلکہ چٹکیوں میں حل کرنے کے سنہری باغ دکھاتے ہیں۔ یہ بے وقوف عوام صرف اتنا سوچ لیا کریں کہ..... چوہدری ممتاز خان جیسے سیاسی اور فصلی بٹیرے، کتنی بار حکومتوں میں آئے، ان کے ذاتی اثاثے کہاں سے کہاں جا پہنچے لیکن ملک کے لیے انہوں نے کیا کیا.....؟ ان کے اثاثوں کا گراف تو ہر دور میں اُوپر جاتا رہا مگر ملک کی ترقی کا گراف مسلسل نیچے آتا رہا، کیا کرتے رہے یہ ملک و قوم اور اس کی عوام کے لیے؟ کہ آج عام طبقہ پانی اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں تک سے محروم ہے۔ مگر افسوس کہ یہی لوگ انہیں بچاتے ہیں۔ اپنی عوامی طاقت کو ایک غلط آدمی کے تحفظ اور اسے بچانے کے لیے صرف کرتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے جتنی بھی عدالتیں بن جائیں، احتسابی کمیٹیاں قائم کر دی جائیں، تحقیقی اور تفتیشی جوڈیشل اکیڈمیاں بن جائیں، حد تو یہ کہ انہیں سزا بھی مل جائے مگر اصل احتساب وہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت بھی واپس لینی چاہیے۔ بس! سمجھو یہی معاملہ چوہدری ممتاز کے ساتھ روا رکھا گیا..... تاہم اس کی رہائی مشروط اور کچھ قدغنوں پر رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے پندرہ سال تک علیحدہ اور ہر طرح سے غیر فعال رہے گا اور کسی بھی حوالے سے کہیں بھی اس کا نام تک نہیں آئے گا۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''وزیر جان کے سلسلے میں کیا حکمتِ عملی جوڑی گئی تھی؟''

''ایک اشتہاری مجرم کی تلاش.....''

''کیا اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی؟''

''ہاں! جب تک میں اپنے عہدے پر رہا، میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ انہی دنوں مجھے کچھ ایسے شواہد ملے تھے کہ وہ ملک سے فرار ہو چکا ہے۔''

''آپ کی ریٹائرمنٹ ایڈمنسٹریشن گراؤنڈ میں کی گئی تھی یا جبری تھی.....؟'' میں نے پوچھا۔ وہ میرے سوال پر ہولے سے مسکرا دیے۔

''مجھے تم سے اس سوال کی پوری اُمید تھی۔ بس! جانے دو اس بات کو..... منہ کھلے گا تو بہت کچھ کھل جائے گا۔ یہاں پھر وہی مصلحت کوشی کی بات آجاتی ہے کہ ایسی کڑوی گولیاں نگلنی پڑتی ہے۔''

''لیکن..... میں وزیر جان کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اسپیکٹرم کا ایک زوئل چیف ہے۔ مقامی سطح پر وہ اسپیکٹرم کو پھر سے فعال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہی نوشابہ کی پشت پناہی اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کر رہا ہے۔ چہرہ بدل گیا ہے، باقی سب وہی چل رہا ہے سر..... اگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' مجھے ایک دم جوش سا آگیا۔

''میں اب بھی ایک پاور ایجنٹ ہوں..... اور کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر ایسے ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کرتا رہوں گا..... چاہے پردۂ زنگاری کے پیچھے ہی سہی.....''

ریاض صاحب میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔

''اب کہاں کا ارادہ ہے؟'' اول خیر نے پوچھا۔ وہ کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ شکیلہ عقبی سیٹ پر

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

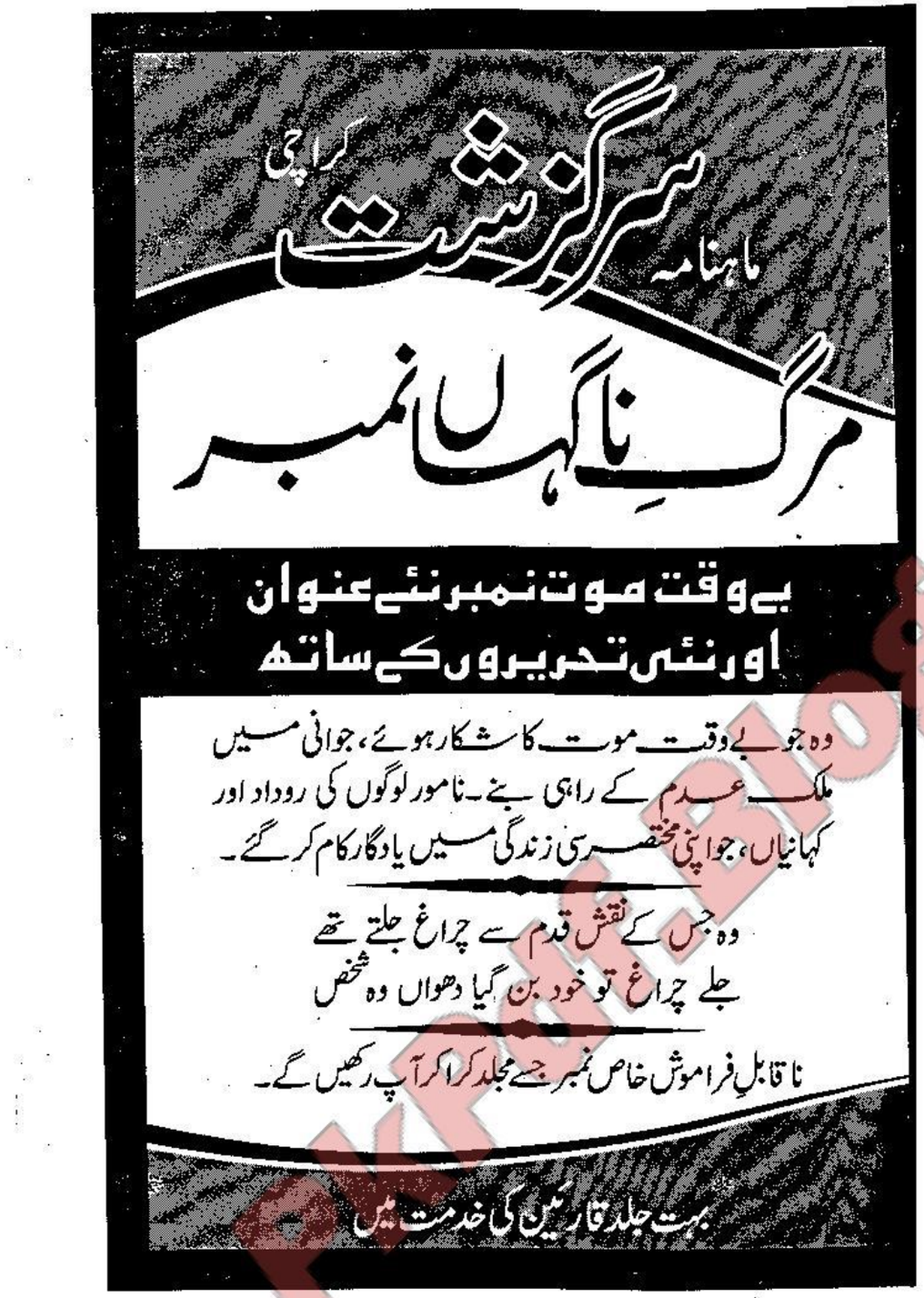
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
مرگِ ناگہاں نمبر
بے وقت موت نمبر نئے عنوان
اور نئی تحریروں کے ساتھ
وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں
ملکِ عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور
کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔
وہ جس کے نقشِ قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص
ناقابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کرا کر آپ رکھیں گے۔
بہت جلد قارئین کی خدمت میں

براجمان تھی۔

''نیلی کوٹھی چلو.....'' میں نے کہا۔

''او خیر.....'' وہ زیرِلب بولا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ میں نے ہونے سے کہا۔

''کیا ہوا.....؟ جاں ورکھنا اور نیلی یاد آ گئے.....؟''

''او خیر..... کاکے! بڑا سیانا ہے، بندے کے چہرے کے تاثرات بھانپ لینا خوب جانتا ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کسرِ نفسی سے کہا۔ ''خان جی کا جب بھی ذکر آئے تو یہ دونوں کردار از خود ذہنوں میں آتے رہیں گے۔'' میں نے کہا اور پھر دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میرا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''اول خیر.....! گاڑی موڑ لو.....'' میرے اچانک یہ کہنے پر وہ ذرا گڑبڑا گیا پھر بولا۔

''او خیر..... کاکے! کیا ہوا.....؟ ارادہ بدل لیا خان جی کے ہاں جانے کا.....؟''

''فی الحال تم عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف چلو.....''

''ہمم.....'' اول خیر کے منہ سے نکلا اور اس نے اسٹیئرنگ موڑ کر راستہ بدل دیا۔

دن خوب چڑھا ہوا اور گرم تھا۔ کار میں اے سی لگا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار عارفہ کی رہائش گاہ کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اول خیر کو ہدایت کی تھی وہ کار گیٹ کے بالکل قریب لے جا کر روک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا، میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ کار رکتے ہی، اندر بنے گارڈ کیبن کے چوکور خانے سے کسی نے کار کو اتنا قریب رکتے دیکھا اور فوراً ماؤزر ہاتھ میں تھامے گیٹ کے بغلی دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے فوراً بعد اسی طرح کا دوسرا گن بردار بھی باہر برآمد ہوا۔ دونوں ہٹے کٹے ''دربان'' تھے اور میرے لیے نئے تھے۔

''اوئے..... یہ کیا حرکت ہے؟ گاڑی اتنے قریب گیٹ کے کیوں روک دی ہے.....؟ پیچھے کرو.....؟'' وہ کوئی بدتمیز سا گارڈ تھا۔ یا پھر اسے کچھ زیادہ ہی ''بااختیار'' رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔

''او خیر.....'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس ناہنجار اور بدتمیز گارڈ سے تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا تم ہر آنے جانے والے مہمان سے اسی طرح پیش آتے ہو؟''

''مہمان گیا بھاڑ میں.....'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ ''پہلے اپنی گاڑی پیچھے کرو اور پھر کار سے نیچے اُتر کر بات کرو.....'' میں نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی۔ اس کا دوسرا ساتھی اس کے پیچھے نہایت محتاط انداز میں کھڑا ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی۔

میں نے اول خیر کو کار تھوڑا پیچھے سرکانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریورس گیئر ڈالا اور کار چند گز پیچھے ہو گئی۔

''اور..... پیچھے کرو.....'' وہ بدتمیز سا گارڈ پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ میں تب تک بھنائے ہوئے انداز میں کار کا دروازہ کھول کر باہر اُتر آیا اور اس تنومند گارڈ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''بس! اب بہت ہو گیا..... جتنی تمہاری اوقات ہے اُتنا ہی پھیلو..... اندر میرا ایک بھتیجا اور بھتیجی رہتے ہیں پنکی اور دانی، ان سے کہو تمہارا چچا آیا ہے.....''

میرے جارحانہ انداز اور بارعب لہجے نے اُسے تھوڑا خفیف کر دیا پھر چچا اور بھتیجے کے ذکر پر بھی وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ تاہم اس کی اکڑ پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''اپنا تعارف کرواؤ..... پہلے کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا گیا ہے.....''

''بچوں سے کہو تمہارا شہزی انکل آیا ہے..... وہ دونوں بھاگتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔''

''شہزی.....؟'' وہ چونکا۔ میرا نام اس طرح زیرِلب دہرانے پر میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا کہ اسے ''شہزی'' سے متعلق پہلے سے ہی کچھ بریفنگ دی جا چکی تھی۔ کیونکہ میری عقابی نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ دونوں روایتی قسم کے خان ٹائپ ڈنڈا بردار چوکیدار نہیں، بلکہ پروفیشنل گارڈز بھی نہ تھے۔ ان سے مجھے ''کار پردازی'' کی بُو آ رہی تھی۔

میری آبزرویشن درست ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ چند قدم پیچھے ہٹے اور اپنے ماؤزر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولے۔

''شہزاد احمد خان ہو.....؟''

''ہاں.....!''

''تب پھر اُلٹے پیروں واپس لوٹ جاؤ.....'' اس کا

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

لہجہ پل کے پل جارحانہ ہو گیا۔ تب تک اول خیر بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر چکا تھا۔ وہ میری طرف سے اشارے کا منتظر تھا۔

''کیوں.....؟'' میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

''ستار! فوراً پولیس کو مطلع کرو.....''

ستار نامی اس کا ساتھی [redacted] پلٹا۔

''اس کی ضرورت نہیں.....'' میں نے پل کے پل سوچتے ذہن کے ساتھ کہا۔

''چلو.....'' میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ستار نامی وہ آدمی بھی جاتے جاتے رک کر پلٹا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں ہم دوسری شاہراہ پر تھے۔

''اوخیر.....! کچھ گڑبڑ لگتی ہے کاکے!'' اول خیر نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم بولا۔

''کسی ایزی لوڈ والے کے پاس کار روکو.....'' اول خیر نے ایسا ہی کیا۔

پی سی اوز کا رواج آج کل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ورنہ گلی گلی میں پی سی او نظر آیا کرتے تھے۔ ایزی لوڈ والوں کے پاس یہ سہولت کبھی کبھار دستیاب ہو جاتی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ میں نے چونکہ بیگم ولا کے لینڈ لائن سے فون کیا تھا اسی لیے کسی نے جان بوجھ کر نہیں اُٹھایا جس کا صاف مطلب تھا کہ اندر ان دونوں بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے ''کارپرداز'' مقرر کیے گئے ہوں گے، جنہیں خاص طور پر میرے سلسلے میں ''بریفنگ'' دی گئی ہوگی۔

ایزی لوڈ والے نے مجھے نمبر ملا کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس الگ تھلگ بات کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ بس، وہیں کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے بات کرنا ہوتی تھی۔

دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ نمبر اجنبی تھا اور یہی میں چاہتا تھا اسی لیے اُمید تھی کہ کال دوسری جانب سے ضرور ریسیو کی جاتی..... تیسری بیل پر مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو.....'' میرا محتاط ذہن اس کی آواز اور لہجے سے کچھ ''اخذ'' کرنے لگا۔

''ہیلو، مجھے دانی سے بات کرنی ہے۔''

مجھے کچھ ٹھیک اندازہ نہ تھا کہ گیٹ پر موجود اُن دونوں گارڈ نما کارپردازوں نے ابھی میرے بارے میں اندر مطلع کیا تھا یا نہیں۔

''آپ کون ہو؟'' دوسری طرف سے اسی خاتون نے پوچھا۔ لہجہ سرد و سپاٹ تھا۔ یہ سب مجھے باہر سے اندر تک کے کارپرداز ایک ہی ''کلیبر'' کے لگے۔ یعنی ہدایت یافتہ۔

''میں ان کا انکل شہزی بول رہا ہوں.....''

''شٹ اَپ! آئندہ فون مت کرنا۔'' خاتون نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ [redacted] اسی وقت [redacted] کوئی میں [redacted] اور گارڈ سمیت اس جدید خاتون کو بھی [redacted]

''بھائی صاحب! بات کرنی آپ نے.....؟'' مجھے اس طرح خالی فون تھامے دیکھ کر دکاندار نے کہا۔

''جی، جی ہاں! شکریہ بھائی!'' میں نے قدرے چونک کر کہا۔ اسے پیسے دیے اور دکان سے نیچے اُترا، اول خیر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''خان جی کے ہاں چلو.....'' میں نے اسے فون والی خاتون کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

''اوخیر..... کاکے! یہ بھی کوئی لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کھیڈ کیا ہوگی اول خیر.....!'' میں نے ایک گہری ہنکاری لیتے ہوئے کہا۔

''عارفہ اپنے دونوں بچوں کو کرائے کے ٹٹو کے حوالے کر گئی ہے۔ انہیں سبق سکھانا کون سی معمولی بات ہے۔''

''اوخیر..... کاکے! ذرا ہتھ ہولا رکھ..... ایک آئیڈیا ذہن میں آیا ہے میرے.....'' وہ پُرخیال سے لہجے میں بولا۔

''بولو.....''

''آج خان جی کے ہاں جانے کا پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا۔ ''پہلے اس حرافہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا جائے اور پتا لگایا جائے آخر اندر وہ کون لوگ ہیں جو دونوں بچوں کے سرپرست بنے بیٹھے ہیں؟''

''کیا فرق پڑے گا اِس سے.....؟'' میں نے بے پروا انداز میں کہا۔

''ایک بات کہوں شہزی کاکے! مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔'' اول خیر کی بات پر ہی نہیں اس کے لہجے نے بھی جانے کیوں مجھے لمحہ بھر کو چونکا دیا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اول خیر، شکیلہ کی

طرح ہی کبھی کبھی دور کی کوڑی لاتا تھا۔

''تم ایک فضول مہم جوئی میں وقت برباد کرنے کی بات کر رہے ہو اول خیر.....!'' پچھلی سیٹ پر کافی دیر سے خاموش بیٹھی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے اور اتنا ضروری بھی نہیں۔ پہلے ہمیں خان جی سے مل لینا چاہیے۔ ممکن ہے نوشابہ وغیرہ سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آئے۔'' اس کا مشورہ بھی غلط نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے اول خیر کی دال میں کالا ہے والی بات نے شبہے میں ڈال دیا تھا۔

''شکیلہ! اول خیر کی بات نے مجھے واقعی ایک بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب پہلے اسی بات کا کھوج لگاتے ہیں۔''

''یہ خیر اتو ہے ہی ایک بے چین روح.....'' شکیلہ نے ہنس کر کہا۔ وہ اسے 'خیرا' ہی کہتی تھی، اور اول خیر اسے 'ناز کی بیگم' یعنی نازک بیگم۔

''جی نازکی بیگم! میں بے چین روح ہوں تو آپ کیا ہیں محترمہ! ایک چڑیل.....''

''چڑیل تو خیر میں نہیں ہوں، تم ایک بدروح ضرور دکھائی دیتے ہو۔'' وہ بولی۔

''اول خیر! گاڑی روک دو.....'' میں نے فوراً کہا۔ ہم کوٹھی سے دور آ گئے تھے۔ یہاں ایک مختصر سا چوراہا تھا۔ میں نے دونوں سے کہا۔

''ایک کام تم دونوں کے سپرد کر رہا ہوں، بہت توجہ اور ہوشیاری سے انجام دینا ہوگا۔ کوٹھی کی خفیہ نگرانی کرو اس وقت تک جب تک کہ کوئی اندر سے گارڈ کے علاوہ برآمد نہ ہو..... اس کی تصویر اتارنا اور اس کا پیچھا کرنا، مزید اس سلسلے میں جو کر سکو کر کے مجھے بیگم ولا آ کر رپورٹ دو.....''

''مگر تم.....؟'' شکیلہ بولی۔

''میں ٹیکسی لے لوں گا اور خان جی سے ملاقات کر کے بیگم ولا پہنچ رہا ہوں.....''

''اوخیر.....!''

کار سے اُترتے ہی مجھے اول خیر کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ٹیکسی کروائی اور اسے مین شاہراہ پر آنے کا کہہ کر جیب سے سیل فون نکالا جو زہرہ بانو نے مجھے عارضی استعمال کے لیے دیا تھا۔ میں نے خان جی سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں مل سکتے ہیں؟ شکر تھا کہ وہ اپنی جاگیر گلاں والی کے بجائے نیلی کوٹھی میں ہی تھے۔ (مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیلی کو طلاق دینے کے بعد اب اس کوٹھی کا اُنہوں نے کیا نام رکھا تھا)

اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم پارٹی اجلاس کے سلسلے میں نیلی کوٹھی میں مقیم ہیں۔

ڈرائیور جب تک ٹیکسی کو مین شاہراہ پر لے آیا تھا۔ تب ہی میں نے اسے ملتان روڈ پر واقع نیلی کوٹھی کے علاقے کا پتا بتایا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔

قریباً نصف گھنٹے بعد ٹیکسی نے مجھے نیلی کوٹھی کے پاس اُتار دیا۔ میں نے کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور دیکھا کہ کوٹھی کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔ جہاں پہلے نیلی کوٹھی کے الفاظ کندہ ہوتے تھے وہاں اب کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں خان جی کی تصویر کے ساتھ پارٹی بینرز آویزاں نظر آ رہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ خان جی پوری شدومد کے ساتھ دوبارہ سیاست میں اپنی انٹری دے چکے تھے اور اپنی سیاسی مہم جوئی کا گڑھ اب شاید مستقل طور پر اسی جگہ کو بنا لیا تھا۔ وہاں مسلح گارڈ کے علاوہ پارٹی ورکرز کی بھی چہل پہل دیکھنے میں آ رہی تھی۔ عام انتخابات قریب تھے اور اسی لیے یہ سارا جوش نظر آتا تھا۔

لیکن..... اچانک مجھے چونکنا پڑا..... کچھ دوسرے زاویے سے مجھے چند ایک اور بھی پارٹی بینرز لگے دکھائی دیے جن پر دیگر پارٹی عہدے داروں کی بھی تصاویر نظر آتی تھیں، انہی میں مجھے ایک شناسا چہرہ بھی دکھائی دیا تھا اور مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ میں ذرا اور قریب جا کے یہ غور دیکھنے لگا کہ کہیں یہ میری نظروں کا دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا جو میں دیکھ رہا تھا، وہ سچ تھا۔

یہ ایک خاتون کا پُرجوش اور دھواں دھار تقریر کرتا ہوا چہرہ تھا۔ میں اس چہرے کو بھلا کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اس چہرے کے ساتھ تو میری بہت سی تلخ، بھیانک اور جاں گسل یادیں وابستہ تھیں۔ صرف یادیں ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور..... مظلوم چہرہ بھی وابستہ تھا، اور اصل حوالہ وہی مظلوم چہرہ تھا۔ وہ بدنصیب آسیہ کا تھا۔ جو ہر سے مجھ سے سوال پوچھتا محسوس ہوتا تھا کہ..... ''شہزی! میں ظلم و جبر کی تاریک بھیانک راتوں میں بڑی بیدردی کے ساتھ روندھ دی گئی، ماردی گئی..... اور میرا قاتل چوہدری ممتاز ابھی تک زندہ ہے، اور..... تم بھی زندہ ہو.....'' بس! فقط یہی ایک سوال ہوتا اس بدنصیب کے نظر آنے والے چہرے پر۔

جس خاتون کی تصویر میں نے بینر پر دیکھی تھی، وہ آسیہ کی باجی یعنی اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کی

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

تھی۔

''ہم..... تو گویا اس نے خان جی کی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔'' میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ جس پر مجھے حیرت تھی اور اتنی ہی اُلجھن بھی کہ خانم شاہ کی تو ماضی میں خان صاحب سے اچھی خاصی مخاصمت چلی آرہی تھی بلکہ وہ تو اس کے آدمیوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہوکر اسپتال بھی جا پہنچی تھی۔ اس لڑائی کی وجہ بھی اگر چہ میں ہی تھا جب خانم شاہ اپنے مفاد کی خاطر مجھے پولیس کو رضا کارانہ گرفتاری کے لیے بہ ضد تھی مگر خان جی اور میں نے اس کی تجویز ٹھکرادی تھی۔ وہ بھی اپنی ہٹ پر قائم تھی اور اس نے دھمکی دے ڈالی تھی وہ پولیس کو بتادے گی کہ میں خان جی کی رہائش گاہ پر چھپا بیٹھا ہوں جس پر خان جی تپ گئے تھے اور یوں خانم شاہ لڑائی میں زخمی ہوگئی تھی تب بھی میں نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ مگر..... اب اسے خان جی کی پارٹی میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے شدید حیرت آمیز اُلجھن ہوئی تھی۔ ایک ہی جواب اس کا میرے ذہن میں آتا تھا کہ کیا..... خانم شاہ اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے..... کسی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کررہی تھی؟

مجھے گیٹ پر ہی شناخت کے لیے روک لیا گیا تو میں نے خان جی کے پرسنل نمبر پر اُن سے رابطہ کرکے اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوراً ہی اندر سے اپنا کوئی خاص بندہ باہر بھیج دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈ فوراً دائیں بائیں ہٹ گئے۔ وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے ملا اور اندر لے گیا۔

ایک طرف پارٹی ورکرز کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا جارہا تھا جہاں عارضی چولہے بنا کر دیگیں چڑھا رکھی تھیں۔ مجھے لانے والا ایک دبلا پتلا مگر خاصا پُرجوش سا میری ہی عمر کا ایک گورا چٹا خوبرو نوجوان تھا۔ جس نے مجھے اپنا نام فرید بتایا تھا۔ وہ مجھے اندر ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا۔ میں اس کمرے کو پہچانتا تھا، یہ نشست گاہ سے ملحقہ کمرا تھا۔ اس طرف سے مجھے لوگوں کے شور اور باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ خان جی نے مجھے اس کمرے میں کیوں بٹھایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک درمیانی عمر کا شخص ٹرالی دھکیلے اندر داخل ہوا۔ مجھے صرف چائے کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے میں نے اس سے یہی فرمائش کرڈالی، اس نے چائے بنا کر ایک نفیس کپ میں نہایت احترام کے سا مجھے تھمادی۔ یہ وہ کمرا تھا جہاں خان جی اپنے خاص مہمانو سے ہی ملاقات کرتے تھے۔ اسی اثنا میں فرید مسکراتا ہ داخل ہوا۔

''شہزی صاحب! خان جی ابھی تھوڑی دیر م تشریف لاتے ہیں، آپ جب تک چائے پیئیں۔''

''شکریہ۔'' میں نے مختصراً کہا۔ وہ لوٹ گیا۔ چا ختم کرلی میں نے تو خان جی بھی آگئے۔ میں انہیں دیکھ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے پہلے سے خاصے کمزور نظر آر تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلائے میر طرف بڑھے اور میں ان کی طرف..... ایک گرمجوش معانقہ ہمارے درمیان ہوا تھا جس کا دورانیہ کئی منٹوں تک رہا تھا مجھے اپنے ساتھ لگا ان کا وجود ایک جذباتی سے ارتعاش سے محسوس ہوتا رہا تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے یار..... تم.....؟ کتنا انتظار مجھے تمہارا..... بیٹھو.....'' وہ مجھ سے الگ ہو کے میر دونوں بازوؤں کو تھام کر محبت سے بولے۔ میں جب بھی اسے اپنے ساتھ اس طرح کے پیار بھرے جوشیلے انداز میں ملتے دیکھتا تھا تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ و کبھی ایک جوان بیٹے کا باپ ہوا کرتا تھا۔ شفقت راجہ کے اندوہناک قتل کے بعد یہ میرا جانی دشمن بن گیا تھا مگر آفریں ہے اس شخص پر کہ اس نے انتقام میں اندھا اور جوش جذبات سے کام لینے کے بجائے ہوش وحواس سے جلد ہی پتا چلا لیا تھا کہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی، اس کے بیٹے کا قاتل میں نہیں بلکہ چوہدری ممتاز اور اس کے حواری تھے۔ تب اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

''میں نے تمہاری پریس کانفرنس سنی اور دیکھی تھی۔ بہت بڑے کارنامے انجام دے کر آئے ہو تم..... خاص کر طلسم نور ہیرا..... اور نوشابہ اور اس کے باپ چوہدری ممتاز کے خلاف اور اسے دوبارہ سزا تلے لانے کا عزم..... واہ بھئی واہ..... دل خوش کر دیا۔ اُن دونوں باپ بیٹی..... کو تو بے چینی کھا گئی ہوگی.....''

ان کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

''ارے تم نے کچھ کھایا ہی نہیں.....؟'' وہ چونک کر بولے۔

''بس! چائے کا ہی دل چاہا تھا، مجھے ذرا جلدی بھی

خالہ

خاتون گود میں بچہ لیے فارمیسی میں آئیں۔ وہ بچے کا وزن کرنا چاہتی تھیں۔ سیلز مین نے بتایا کہ بچوں کا وزن کرنے کی مشین مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ بڑی مشین پر ماں اور بچے کا وزن کرکے اس میں صرف ماں کا وزن گھٹا دیا جائے تو آسانی سے بچے کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

خاتون نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے کار ہے..... کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں بچے کی ماں نہیں، خالہ ہوں۔''

کراچی سے میمونہ عزیز کا عذر

ہے، بس! ابھی آپ کو سلام کرنے آیا تھا، پھر کبھی تفصیلی ملاقات ہوگی.....'' میں نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا تو وہ پریشان سے ہوگئے، بولے۔

''ارے..... رے..... نہیں بھئی، تم اب کچھ روز اِدھر ہی رہو گے..... دیکھ نہیں رہے ہو..... کیسی ہنگامہ خیزی پال رکھی ہے میں نے..... کیسے کیسے لوگ میری پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے لگے ہیں..... سیاست میں یہی ہوتا ہے، کسی کی مخالفت میں کسی کا فائدہ..... سمجھو تو یہی فائدہ ہم اُٹھا رہے ہیں..... ہمیں سپورٹ بھی ہے.....'' آخر میں اُنہوں نے مجھے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری تھی اور میں تھوڑا چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ذہن میں ہنوز خانم شاہ کا نام گردش کررہا تھا۔

''میں تو تمہیں بھی اپنی پارٹی میں ایک بڑا عہدہ دے کر شامل کرنا چاہتا ہوں..... تمہاری انٹری بڑی دبنگ اور دشمنوں کی نیندیں اُڑا دینے کے لیے کافی ہوگی اور اگلے الیکشن میں ہماری جیت یقینی کی ضمانت بھی.....''

نجانے کیا بات تھی آج زبیر خان المعروف خان جی مجھے اور ہی روپ میں نظر آرہے تھے۔ آخر انہیں کس کی سپورٹ حاصل ہوگئی تھی؟ یہ اتنے پُرامید اور پُرجوش کیوں تھے؟ میری اور چوہدری ممتاز یہ شمول اس کی بیٹی نوشابہ کی دشمنی سے یہ کس قسم کا فائدہ اُٹھانے کی سوچے ہوئے تھے؟ میں ایک دم محتاط ہوگیا اور بولا۔

''خان صاحب!''

''اُونہہ..... نو خان صاحب! کتنی بار کہا ہے، مجھے صرف انکل کہو.....'' وہ ہنسے۔

''معافی چاہتا ہوں، انکل! میں سیاست بازی سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں، یہ میرے قبیل میں ہے نہ ہی بس میں.....'' میں نے جواب دیتے ہوئے فوراً موضوع بدلا اور خانم شاہ کا ذکر کرڈالا۔ وہ ہنسے۔

''تو تم نے اس کی باہر بینر پر لگی تصویر دیکھ ہی لی..... اس نے حال ہی میں ہماری پارٹی جوائن کی ہے.....''

''بہت اچھی بات ہے.....'' میں نے کہا۔ ''لیکن.....

حیرت ہوئی..... خانم شاہ تو آپ کو اپنے دشمنوں کی قطار میں سمجھتی آرہی تھی اور آپ پر کیس کرنے کی تیاری میں تھی۔''

''اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوگیا تھا۔''

''اچھی بات ہے، خوشی ہوئی یہ سن کر.....'' میں نے لے سے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے مگر میں پھر کبھی آنے کا وعدہ کرکے لوٹ آیا۔ انہیں حیرت تھی کہ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔ دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئے تو انہیں یہ بتا چلا تھا۔

''کمال ہے، کیا زہرہ بیگم کے پاس گاڑیوں کی کمی ہو گئی ہے؟''

''ایسی بات نہیں، انکل!'' میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ کچھ ساتھی تھے، انہیں اچانک کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا، گاڑی وہ لے گئے تھے، میں ٹیکسی میں آگیا۔''

خان جی نے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت مجھے دے دی مگر میں نے معذرت کرلی۔

''کیا بات ہے، بہت غیریت برتنے لگے ہو.....'' وہ شکایتی لہجے میں بولے۔ میں مسکرایا اور رسان سے بولا۔

''ایسی بات تو نہیں انکل! دراصل مجھے دو ایک اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔ بلاوجہ فکر رہے گی، ٹیکسی کرا دیں یہی بہت ہے۔''

اُنہوں نے ٹیکسی کروا دی اور ڈبل کرایہ ٹیکسی والے کو دے دیا کہ میں اسے جہاں کہوں وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا اور ان سے رخصت ہو کے چلا آیا۔

میری توقع کے خلاف خان جی سے ملاقات بہت مختصر رہی۔ شاید ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ اپنی انتخابی مہم میں معروف تھے اور میں نے بھی ان کا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ خاص باتیں نہیں بتائی تھیں جن کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ ان کی ناچ میں سب

Visit:- PkPdf.Blogspot.Com

کچھ دیر ہی تھا جو میں بھی جانتا تھا، جبکہ ایڈووکیٹ خانم شاہ کی ان کی پارٹی میں شمولیت نے مجھے جانے کیوں ایک نامعلوم سی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خان جی نے کسی ''سپورٹر'' کا ذکر کیا تھا اور اس بارے میں خود میں بھی تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بات بری لگی تھی کہ خان جی نے میرے استفسار کے باوجود مجھے اس کا نام بتانے سے گریز کیا تھا۔ وہ آخر اپنے سپورٹر کا نام مجھ سے کیوں مخفی رکھنا چاہتے تھے؟ کم از کم مجھے تو بتا دینا ہی چاہیے تھا جبکہ ہم نے پہلے کبھی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

پتا نہیں اب یہاں کون سی نئی کھچڑی پکنے لگی تھی، میں اپنے ذہن کو زیادہ اُلجھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت میرا امریکا روانگی کا پروانہ جاری ہونے والا تھا۔ میں کسی نئے چھڑے میں ٹانگ اڑانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کم از کم خان جی کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں نے اول خیر اور شکیلہ کے متعلق اندازہ قائم کرنا چاہا کہ انہوں نے اب تک اپنے حصے کا کتنا کام نمٹایا ہوگا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہاں سے کوئی خاص پیش رفت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ مجھے انہیں عارفہ کی کوٹھی کے قریب چھوڑے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو عارفہ کی کوٹھی کے علاقے کا نام بتا دیا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔

آدھے گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی والے کو میں نے روانہ کر دیا اور خود مٹرگشت کے انداز میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے ان دونوں کو کار سمیت چھوڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ کار سمیت دونوں ہی وہاں سے غائب تھے جس کا صاف مطلب تھا انہوں نے یقیناً عارفہ کی کوٹھی سے کسی مشکوک شخص کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ ضرور ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے، لہٰذا اب وہ اپنا ''کام'' نمٹانے کے بعد سیدھا بیگم ولا کا ہی رخ کریں گے۔

میرا اب یہاں کھڑے رہنے کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار مجھے نظر آئی، اس کا رخ عارفہ کی رہائش کی طرف جانے والے راستے پر ہی تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس میں دو افراد سوار تھے۔ میری عقابی نظروں نے فوراً انہیں تاڑنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی ہنڈا سٹی تھی۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر شاید اے سی آن تھا۔ ایک تو ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر میں کوئی سوٹ پوش شخص بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بھاری اور چہرہ پر گھنی مونچھیں تھیں، رنگ سانولا تھا، میرے لیے دونوں کی صورتیں اجنبی تھیں۔ کار ایک موڑ پر غائب ہو چکی تھی میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف کو گیا تو میرا اند درست ثابت ہوا۔ کار عارفہ کی کوٹھی کے گیٹ سے اندر دا ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہ گیا کہ یہ دو افراد ک تھے؟ آخر عارفہ کی کوٹھی میں..... اس کی غیر موجودگی میں گل کھلایا جا رہا تھا؟ مجھے نامعلوم سے تجسس نے بے چین دیا اور میں نے سردست بیگم ولا جانے کا ارادہ ملتوی کر د مجھے جانے کیوں دانی اور پنکی کی فکر لاحق ہونے تھی۔ دانی اور پنکی سے میرا رشتہ بڑا جذباتی تھا۔ وہ دونو بھی مجھ سے ایسا ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ جبکہ سرمد بابا (م منظور وڑائچ) کے الفاظ بھی مجھے یاد تھے کہ ''شہزی میرے ان دونوں بچوں (پوتے پوتی) کا خیال رکھنا، ج تک عارفہ جیسی ناگن اور نوید سانپ والا جیسا سانپ ز ہے، یہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں..... اور میں نے سرمد بابا سے وعدہ کیا تھا۔

یہ تو خیر حقیقت ہی تھی کہ عارفہ کبھی اپنے بچوں کا نہیں سوچے گی مگر نوید سانپ والا ایک زہریلا سانپ تھا۔ قول سرمد بابا مرحوم کہ، وہ بدبخت ان کی بیوہ بہو عارفہ پھنکارتے ہوئے تھا اور وہ اس کے بہکاوے میں آئی ہو تھی۔ جبکہ تنہائی کی ماری ہوئی عارفہ کی آنکھوں پر جذباتیت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مکار نوید اس کی ا کمزوری سے کھیل رہا تھا۔

کار اندر داخل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اب کیا کروں.....؟ بالآخر میرے اندر کی بے چی نے مجھے دھکیلا کہ چاہے کچھ بھی ہو..... اندر جا کر دیکھ چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کیا تھا؟ آخر عارفہ اپنے دونوں ٹین ایجر بچوں کو کن لوگوں کے حوالے کر کے اپنے نئے شوہر ساتھ بیرونِ ملک ہنی مون کے لیے گئی تھی؟

یہ تہیہ کرنے کے بعد میں ابھی اپنی پیش قدمی کا جائز لے ہی رہا تھا کہ اچانک میں چونکا۔ گیٹ سے وہی کا دوبارہ برآمد ہو رہی تھی۔ اتنی جلدی اس کی واپسی کی مجھ توقع نہ تھی، میں ایک اور بنگلے کی دیوار کے سرے پر کھڑ تھا۔ پوش علاقہ ہونے کے باعث اطراف میں سناٹا پھیلا ہو تھا۔ کار میں وہی ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ خال تھی جہاں میں نے اس سوٹ پوش موچھیل کو براجمان دیکھ تھا۔ البتہ عقبی سیٹ پر میں پنکی کو بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونکا۔

''یہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟'' ایک دم میرے تھکے ہوئے ذہن میں سوالیہ نشان اُبھرا۔ میں بے چین ہو گیا۔ کار مین شاہراہ کی طرف جا رہی تھی، میں راستہ کاٹ کر دوڑا..... اور ایک ٹیکسی والے سے بات کر کے اسے ایک متوقع راستے پر پہنچنے کا کہا۔ وہ حیران اور پریشان ہوا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا، مگر میں نے اپنا کارڈ شو کر کے اس سے کہہ دیا کہ میں خفیہ پولیس کا مخبر ہوں، وہ بے فکر رہے اسے منہ مانگا کرایہ ملے گا۔ وہ بھی کوئی من موجی سا آدمی تھا، بولا۔

''او جی..... سیدھا کرایہ ہی مل جائے، یہی بہت ہے۔'' وہ شاید پولیس والوں سے نالاں نظر آتا تھا۔

''ملے گا..... چلو۔'' میں نے فوراً کہا اور اسی وقت متوقع راستے پر میں نے اسی ہنڈا کار کو نمودار ہوتے دیکھا۔

''وہ دیکھو، سیاہ ہنڈا..... اسی کا بڑی ہوشیاری سے تعاقب کرنا ہے جہاں یہ رکے وہاں ذرا فاصلے سے مجھے بھی تار دینا، پھر تم فارغ.....'' میں نے اس سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کار مین روڈ پر آ کر فراٹے بھرنے لگی۔ روڈ میں ریفک بھی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اس کار کو کھو نہ دے مگر وہ بھی ہوشیار آدمی تھا۔ ہنڈا کا تعاقب کرتا رہا۔ ایک دو بار تو کار نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی مگر ڈرائیور نے سے جلد ہی جا لیا تھا۔ یہ سفر کم و بیش پندرہ سے بیس منٹ اری رہا اور جب میں نے دیکھا کہ کار ایک کوچنگ سینٹر کے سامنے رک گئی ہے تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گویا لی کو چنگ کی کلاس تھی۔ میں نے ٹیکسی روکنے کا کہا اور رائیور کا شکریے کے ساتھ کرایہ ادا کر کے اسے چلتا کر دیا۔ ہاں اور بھی گاڑیاں موجود تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ لی کار سے اُتری۔ اس کے کاندھے پر شولڈر بیگ تھا وہ در چلی گئی تو کار حرکت میں آ گئی۔ جب وہ نظروں سے جھل ہو گئی تو میں آگے بڑھا اور کوچنگ سینٹر میں داخل ہو لیا۔ یہ خاصا مہنگا اور مشہور کوچنگ سینٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس ی عمارت بڑی اور جدید اسٹائل کی بنی تھی۔

ایڈمنسٹریشن کے کمرے میں پہنچ کر میں نے سعدیہ سے ملنے کی درخواست کی۔ پہلے تو مجھ سے میرا نام اور پنکی سعدیہ) سے میرا تعلق پوچھا گیا۔ پھر کہا گیا کہ ہم اسے للاع دے دیں گے۔ اگر اس نے آپ کو پہچان لیا تو ٹھیک ورنہ..... آپ جا سکتے ہیں۔

وہ پرنسپل یا منتظم ٹائپ کا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ تاہم نے آخر میں یہ کہا تھا کہ ابھی تو کلاس ہو رہی ہے، ایک گھنٹے بعد بریک ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

مجھے منتظم کا رویہ کچھ روکھا سا محسوس ہوا۔ وہ ایک بھاری جسامت کا عمر رسیدہ شخص تھا۔ کرخت مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا کہا کہ آپ باہر کہیں کھڑے ہو کر انتظار کر لیں۔ مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل کر باہر جانے کے بجائے دائیں جانب بنے کوریڈور کی طرف گھوم گیا، یہاں ٹھنڈے پانی کے واٹر ڈسپنسر رکھے تھے، میں بظاہر پانی پینے کے بہانے اس طرف مڑا تھا مگر مقصد میرا اس کھڑکی کے قریب آنا تھا جو منتظم کے کمرے میں کھلتی تھی۔ جس کا نظارہ میں اندر سے کر چکا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کے رویے نے چونکا دیا تھا۔ کچھ شبہے کی بُو مجھے آئی تھی یا کوئی ایسی کھٹک جاگی تھی کہ یہ مجھے اپنے کمرے سے اس طرح روانہ کرنے کے بعد کیا کرتا ہے؟

''ہیلو، باہر ایک لمبا چوڑا اور اسمارٹ سا نوجوان کھڑا ملے گا تمہیں..... جس نے سیاہ جینز اور میرون کلر کی چست پینٹ پہن رکھی ہے۔ اس پر نظر رکھنا۔'' میں نے کھڑکی کے قریب سرک کر اس کی باتیں سنیں اور مجھے سانپ سونگھ گیا۔

''ہاں..... ہاں! ابھی نظر آ جائے گا، ابھی تو میں نے روانہ کیا ہے اسے اپنے کمرے سے.....'' منتظم بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔

''ہیلو، ہاں، راٹھور صاحب! ابھی ابھی ایک مشکوک سا شخص سعدیہ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ اپنا نام صرف شہزاد ہی بتایا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں ملنے دیا ہے، ابھی تک..... جی ٹھیک ہے آپ آ جائیے، مگر خیال رکھیے گا کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو..... آپ کی ہدایت تھی اسی لیے آپ کو اطلاع کر دی..... ساکھ کا معاملہ ہے یہ..... جی جی! بہت بہت شکریہ..... آپ کی مہربانی ہے۔''

اس کی باچھیں پھیلتی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی راٹھور نامی شخص نے اسے پنکی سے متعلق محتاط کر رکھا تھا اور اس میں یقیناً اس نے انعام کا بھی لالچ رکھا ہوگا۔ گویا میری بھنک کوٹھی سے نکل کر چار دانگ پھیل گئی تھی۔ راٹھور نامی شخص کون ہو سکتا تھا؟ غالباً یہ نوید یا عارفہ کا ہی رکھا ہوا آدمی ہو گا۔ جو دونوں بچوں کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہوگا۔ مگر کیوں.....؟ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ انہیں یہ قدم اُٹھانا پڑا۔ ایک اور خیال ذہن میں آتا تھا کہ کیا خبر یہ عارفہ کے بجائے صرف سیٹھ نوید سانپ والا کی ہی کارستانی ہو مگر کیوں.....؟ اس کیوں کا جواب خاصا اسرار بھرا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اس راٹھور نامی شخص کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش چاہی، کہیں یہ وہی سوٹ بوٹ اور موچھیل سا شخص تو نہ تھا جسے اسی کار میں، میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا؟

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر جلدی سے پانی پینے کے لیے ایک واٹر ڈسپنسر کی طرف بڑھا۔ کیونکہ میں نے وہاں ایک نیلی وردی والے چوکیدار کو دیکھا تھا جو اسی طرف آرہا تھا۔ وہ مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، سمجھ نہیں آرہا تھا مجھے اب کیا کرنا چاہیے، یہاں بھی دال گلتی نظر نہیں آرہی تھی۔ تب ہی میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پلٹ کر تیزی سے زینے چڑھتا چلا گیا، جہاں کلاس روم کے طور پر مستعمل کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اب ایک ایک کمرے میں کھڑکی کے راستے جھانکنے لگا۔ کلاس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک ایک کلاس میں جھانکتا رہا اور دفعتاً چونکا۔ کھڑکی سے دو پنچیں چھوڑ کر میں نے پنکی کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ ڈیسک ٹیبل پر جھکی کچھ لکھنے میں محو تھی۔ لیکچر ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ لے جا کر ہولے سے اسے آواز دی۔ چند ایک اسٹوڈنٹس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔ پنکی پہلے تو مجھے پہچان ہی نہ سکی۔ پھر جب پہچانی تو اس کا منہ یکلخت حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے اسے کلاس روم سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور دور ہٹ گیا۔

مجھے جلدی تھی۔ کسی وقت بھی راٹھور نامی وہ آدمی یہاں پہنچنے والا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ انتظامیہ کا کوئی آدمی بھی یہاں نکل آتا۔

شکر ہوا کہ ذرا ہی دیر میں..... پنکی باہر آ گئی۔ وہ بے اختیار "شہزی انکل" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"شہزی انکل آپ کہاں چلے گئے تھے، میں اور زانی بھائی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "ماما! بہت گندی ہیں، انہوں نے ہماری ناراضی کے باوجود اس گندے آدمی سے شادی کر لی ہے؟" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

میں نے اسے پیار کیا اور دور میرے سے الگ کر کے بولا۔

"پنکی بیٹا! پریشان مت ہونا، اب میں آ گیا ہوں ناں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، میں نے تمہارے گھر آنے کی کوشش بھی کی تھی مگر مجھے نہیں آنے دیا گیا۔"

"مجھے معلوم ہے انکل!" وہ غمناک آنکھوں سے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

"انکل ماما اور اس گندے آدمی نوید نے ہماری حفاظت کے نام پر بدمعاش لوگوں کو ہماری نگرانی پر رکھا ہے، یہ بات مجھے اور زانی کو بالکل بھی پسند نہیں۔ زانی تو جو ہے وہ ان سے لڑ بھی پڑتا ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں، مر ان کے منہ لگے لیکن شہزی انکل! مجھے ایک بات پر بڑی تشویش ہے۔" اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا جس پر میں چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

پنکی مجھے کافی سمجھدار نظر آ رہی تھی۔ وہ اب بچپنے سے لڑکپن..... میں داخل ہو رہی تھی۔ بالکل ایک پیاری سی، سمجھدار مگر ٹین ایجر لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔

"شہزی انکل! بھائی تو نہیں البتہ میں ان لوگوں کی باتیں چھپ کر سنتی رہتی ہوں، چاہتی تھی کہ کاش کوئی ہماری مدد کو آ جائے..... آپ تو اس برے وقت میں بہت یاد آئے تھے ہمیں..... مگر میں نے یہ بات زانی بھیا کو نہیں بتائی ہے کیونکہ وہ غصے والا ہے اور مجھے ڈر ہے کہیں جوش میں منہ نہ کھول دے، اس لیے میں نے یہ بات اپنے تک ہی محدود رکھی تھی۔

"کیسی بات.....؟ جلدی بتاؤ مجھے..... وقت کم ہے بے بی!" میں نے بے چینی سے کہا۔ میں نے دیکھا اس کا معصوم سا چہرہ متفکر اور سراسیمہ سا نظر آنے لگا جیسے وہ یہ بات بتاتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو، تاہم اٹک اٹک کر بولی۔

"شہ..... شہزی انکل! وہ..... مم..... ماما کی جان سخت خطرے میں ہے....."

"کیا.....؟" میری دونوں بھویں سکڑ گئیں..... ٹھیک اسی وقت پنکی کے حلق سے دبی دبی چیخ سی خارج ہو گئی، میں چونکا۔ اس کی آنکھوں میں پل کے پل خوف اتر آیا تھا اور وہ میرے عقب میں نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

کوریڈور کے سرے پر جہاں زینہ تھا، وہی سوٹ بوٹ والا موچھیل شخص کھڑا ہماری طرف زہر خند نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہمراہ نیلی وردی میں ایک گارڈ بھی کھڑا تھا وہ دونوں بیک وقت ہماری طرف بڑھے تھے.....

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ